

ڈاکٹر شفیع الرحمن

ایک مطالعہ

ڈاکٹر رحیمہ پروین



ڈاکٹر شفیق الرحمن

— ایک مطالعہ

ڈاکٹر رحیم پروین

VIJAY PUBLISHERS

5, GOLA MARKET, DARYA GANJ,
NEW DELHI - 110 002

TELEPHONE : 327 2402.

DR.SHAFIQ.UR.REHMAN: EK MUTALA (BIOGRAPHICAL STUDY)
BY DR.REHANA PARVEEN . RS. 100/-

ڈاکٹر شفقت الہ لحسن

ایک مطالعہ —

ڈاکٹر ریحانہ پروین

وہے پبلشر

5 گولام کیٹ دریانگ۔ نئی دہلی۔ 110002

(C) ڈاکٹر ریحانہ پروین
160014-II/T-25-چندی گڑھ

اشاعت : 1997
قیمت : ایک سوروپے
طبعات : جے۔ اے۔ آفیٹ پریس دہلی
کمپیوٹر کمپوزنگ : ذکی کمپیوٹر ایس۔ 11/جوگا بانی ایکسٹریشن جامعہ نگر، نئی دہلی
سرور ق : رضاق ارشد

ناشر: 
وہی پبلیشورز، 5 گولامار کیٹ، دریائیخ، نئی دہلی 110002

انتساب

والدہ محترم جناب سعید الدین خاں صاحب

اور

والدہ محترمہ اختری بیگم

کے نام

جن کی شفقتوں اور دعاوں نے
محبے اس لائق بنیا کے میں بات کہ سکوں۔

ترتیب

9	کچھ مصنفہ کے بارے میں / ناشر
11	اپنی بات
15	1۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن کا عہد
22	2۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن کی شخصیت کے اہم پبلو
34	3۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن . بحیثیت افسانہ نگار
58	4۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن . بحیثیت مزاح نگار
74	5۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن . بحیثیت پیر و ذی نگار
83	6۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن . بحیثیت حزن نگار
92	7۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن . بحیثیت مترجم
95	8۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن اور کرکٹ
102	9۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن کا ادبی مقام

کچھ مصنفوں کے بارے میں

ڈاکٹر ریحانہ پروین بھوپال کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ جہاں تعلیم کا چرچا عام تھا۔ بھوپال کی ادبی فضنا اور گھریلو ماحول تعلیمی صلاحتیں کو بروئے کار لانے میں معاون ثابت ہوئے۔ برکت اللہ یونیورسٹی۔ بھوپال سے ملحق مسارانی لکشمی گورنمنٹ کالج سے بنی۔ اے۔ اور ایم۔ اے (اردو) کے امتحانات پاس کیے۔

ڈاکٹر بارون ایوب سے شادی ہوئی تو سرال میں بھی ادبی ماحول ملا۔ پچھا سر جناب ابراہیم یوسف (جو اردو ڈرامے کا ایک اہم نام ہے) سے بہت کچھ سیکھا اور طبیعت لکھنے پڑنے کی طرف مائل ہوئی اور "ڈاکٹر شفیق الرحمن، ایک مطالعہ" کے عنوان سے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ پروفیسر آفاق احمد صاحب کی نگرانی میں گھریلو ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے لکھا۔ جس پر 1989 میں برکت اللہ یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کرے۔

تقریباً 5 سال (1982 سے 1987) شعبہ اردو۔ بہجات یونیورسٹی چندی گڑھ میں بحیثیت پارت نام کپر کام کیا۔ 1988 میں شعبہ ایونگ اسٹیڈیز۔ بہجات 9

یونی درسی۔ چندی گڑھ سے وابستہ ہو گئیں اور تب سے بحثیت اردو لکھنے کی کلassez پڑھاری ہیں۔

درسی مصروفیات اور گھریلو ذمہ داریوں میں سے کچھ وقت نکال کر کہانیاں اور مضامین لکھتی رہتی ہیں۔ جو رسائل میں خلائق ہوتے رہے ہیں، کبھی کبھی ادبی محفلوں میں بھی شرکت کرتی رہی ہیں۔

ناشر

اپنی بات

ڈاکٹر شفیق الرحمن اردو کے منفرد مذاہ نگار ہیں۔ اردو کے مزاحیہ ادب میں ان کا اسلوب ایک روایت بن چکا ہے۔ ایسی روایت جو علم و ادب کی شستہ اور شاستہ اور مزاحیہ اقدار کا حامل ہے۔ جب ہم ان کے فن کا سیر حاصل جائز ہے میں تو ایک تنوع شخصیت سے ہماری ملاقات ہوتی ہے۔ جو ایک فوجی افسر ہے تو معلم بھی ہے جس کے باتح میں انجکشن ہے جو نسخہ۔ شفا لکھتا ہے اور جس کی مزاحیہ افسانہ نگاری جراحتوں بھری دنیا کے لیے نسخہ۔ شفا کا کام انجام دیتی ہے۔ جو اداس دلوں کو شاد کام کرتا ہے اور افسر دہ طبیعتوں کو خوشی کے لمحات عطا کرتا ہے۔ جس کے بغیر یہ دنیا جینے کے قابل نہیں رہتی۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اپنے مخصوص انداز میں انسانیہ، افسانے اور پریروڈیاں لکھی ہیں اور تراجم بھی کیے ہیں مگر ان کا اپنا مخصوص رنگ ہر جگہ اپنا کمال دکھاتا ہے اور غالب نظر آتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ حزن کا بیان کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود اس کرب سے گزرے ہوں۔ اس کی ایک ایک کیفیت سے واقف ہوں۔ پھر حزن میں رومانیت کی آمیزش اس خوبصورتی اور بر جستگی سے کرتے ہیں کہ افسانے کے مطالعے کے بعد ماہیوس انسان میں بھی

جسینے اور غم برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ آپ نے اپنے افسانوں میں اپنی شخصیت کو ایک کردار کی صورت میں پیش کیا ہے۔ کیونکہ زیادہ افسانے بیانیہ انداز میں لکھے ہیں۔ ولپسپ اور قابلِ قدر بات یہ ہے کہ جہاں آپ نے کرداروں کے محاذ کی نشاندہی کی ہے وہاں معائب سے بھی چشم پوشی نہیں کی ہے۔

1491 میں ڈاکٹر شفیق الرحمن کا پہلا افسانوی مجموعہ "کرنیں" منظرِ عام پر آیا تو افسانوی ادب میں ایک انقلاب سا بروپا ہو گیا کیونکہ اس مجموعہ سے نہ صرف آپ کو شہرت ملی بلکہ مستقبل کے عظیم مزاح نگار کے پیدا ہونے کی بشارت بھی ملی۔

یہ میراپی۔ اپچ۔ ڈی۔ کا مقالہ ہے۔ جو میں نے پروفیسر آفاق احمد صاحب کی نگرانی میں لکھا تھا۔ 9891 میں مجھے اس پر بھوپال یونیورسٹی سے پی۔ اپچ۔ ڈی۔ کی ذکری تفویض کی گئی تھی، لیکن یہ کتاب جو اس وقت آپ کے باتحوں میں ہے۔ اس مقالے کا خلاصہ کسی جا سکتی ہے کیونکہ اصل مقالہ 385 صفحات پر مشتمل ہے۔ چھپائی و کتابت وغیرہ کی دشواریوں کو بد نظر رکھتے ہوئے، میں اس مقالے کے کچھ خاص حصے ہی شائع کرنے کی جسارت کر رہی ہوں۔

میں نے اس مقالے میں اپنی بساط بھر ڈاکٹر شفیق الرحمن کی ادبی کاوشوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ جو نصف صدی پر محیط ہے۔ پچ تو یہ ہے کہ یہ مقالہ ان تمام کوتاہیوں کی تلافی بھی کرتا ہے۔ جو ڈاکٹر شفیق الرحمن کے فن کا مکمل جائزہ لے کر آج تک ہوتی رہی ہیں۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن نے جن دنوں لکھنا شروع کیا تو پے در پے آپ کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آئیں اور لوگوں کی زبان پر آپ کا نام برابر رہا لیکن جوں جوں فرانص منصبی میں اضافہ ہو گیا۔ لکھنے کی رفتار میں کمی آتی گئی تو لوگوں نے

آپ کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ بھولے تو نہ لوگ آپ کو اس وقت تھے اور نہ آج بھولے میں، مگر وقت کی گردش کا شکار ہوئے۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن کی کردار نگاری کی ایک اہم بات یہ ہے کہ آپ نے اردو ادب کو "خوبی" کے انداز کا ایک جیتا جاتا بھرپور کردار "شیطان" دیا ہے، جو اردو کے مزاحیہ ادب کی آبرو ہے۔ جب جب آپ حضرات ایسے افسانوں کو پڑھیں گے، جن میں شیطان کا کردار موجود ہے۔ مہتے مہتے لوٹ پوت ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن کی شخصیت اور فن کا احاطہ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا کیوں کہ ان کے بارے میں لکھتے ہوئے ہمارے نقادوں نے بہت بخشنده سے کام لیا ہے، کرشن چندر، حجاب امتیاز علی کے دیباچوں کے علاوہ محمد خالد صاحب کے مضمون کے علاوہ کوئی اور قابل ذکر مضمون نظر نہیں آتا البتہ مجھے برس ششم اکرام اور فرید احمد کے دو انٹرویو ضرور پڑھنے کو ملے، اس لحاظ سے مجھے بہت محنت کرنا پڑی، مگر اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بھاری بھر کم ناقدین کی آراء سے مرغوب ہونے کے بجائے، مجھے آزادانہ طور پر اپنی رائے قائم کرنے کا موقع

ملا۔

اس مقالے کی تیاری میں تقریباً تین سال کا عرصہ صرف ہوا۔ میرا یہ خوشگوار فرض ہے کہ میں جناب محترم پروفیسر آفاق احمد صاحب کا شکریہ ادا کروں، جن کی بدایات اور رہنمائی کے بغیر میں اس وسیع موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتی تھیں۔ آپ نے جس خلوص اور لگن سے قدم قدم پر میری رہنمائی کی اور بیش بہا مشوروں سے نوازا، میں انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گی۔

میں اپنے چچا سر پرنسپل ابراہیم یوسف صاحب کی شکرگزار ہوں، جنہوں نے مجھے حوصلہ دیا، مطلوبہ کتب کی فراہمی میں مدد کی اور اپنی ذاتی لا تبریری سے

استقادہ انہانے کی اجازت دی۔ انہیں وقت بے وقت تکلیف دی اور ان کے خلوص کا بے پناہ فائدہ اٹھایا۔ میں محترم برادر ڈاکٹر شوکت سعید خاں اور صولت سعید خاں اور جناب مسین عبدالی صاحب کی بے حد ممنون ہوں۔ جنہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا اور مطلوبہ مضامین کی فراہمی میں مدد کی۔

میں اپنے شوہر ڈاکٹر بارون ایوب کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتی ہوں کیونکہ ان کے تعاون نے میری بست سی مشکلات کو آسان بنادیا۔

رسیحانہ پروین

ڈاکٹر شفیق الرحمن کا عہد

ڈاکٹر شفیق الرحمن کا زمانہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ ہے۔ اس عہد کے افسانے نگاروں نے ادب کو زندگی سے بہت قریب کر دیا اور زندگی کی سچائیوں اور حقیقوں کو اپنے افسانوں میں اس طرح پیش کیا کہ وہ افسانہ نہ معلوم ہو کر زندگی کی سچائی کا پیکر بن کر سامنے آیا۔ زندگی میں جوں جوں پچیدگیاں بڑھتی گئیں۔ تھے تھے مسائل پیدا ہوتے گے جہاڑے افسانے نگاروں کو موضوعات لئے چلے گے اور وہ انھیں صداقت اور سچائی سے پیش کرتے رہے۔ بقول وقار عظیم:

”حوادث کی ہوائیں اپنے ساتھ ایسی خس و خاشک لاتی ہیں
جن کی تمیں انسانی جسم اور روح کو اپنے نیچے دبا کر۔ اسے ایک
مستقل کرب میں بستا کر دیتی ہیں۔ ادب اور ادیب دونوں
اس کرب کے ترجمان بن کر اس کے مواد کی جستجو میں
سرگردان نظر آتے ہیں۔“

ترقبہ پسند تحریک اپنے عہد کے ابتدائی پنج سالوں میں تبلیغی زیادہ نہ رہی

بلکہ انقلاب کی آمد کا اعلان کر کے ذہنوں کو تیار کرتی رہی اور آنے والے خطرات کا احساس دلانا ہی اس کا اساس تھا۔ لیکن بہت جلد ترقی پسند تحریک اس دور میں داخل ہو گئی، جہاں زیادہ توجہ تنقید پر دی جانے لگی۔ ایسی محفلیں منعقد ہونے لگیں، جن میں افسانے پڑھے جاتے اور پھر جم کر بحث کی جاتی اور سخت گیری کے ساتھ محاسبہ بھی کیا جاتا۔ نتیجہ میں کچھ نئے لوگ اس محفل میں داخل ہوئے اور کچھ پڑانے لوگ اس تحریک کو چھوڑ کر چلے گئے لیکن اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جگی بات کرنے کا عزم ہمارے افسانہ نگاروں میں پیدا ہوا۔ اس چیز نے ترقی پسند تحریک کے تحت لکھے جانے والے افسانوں میں بڑی وسعت، بلندی اور گہرائی پیدا کر دی اور اردو افسانے کی مقبولیت اپنے باامِ عروج پر پہنچ گئی۔

”افسانوں کے موجودہ سرمائے کو دیکھیے تو اس میں ترقی پسندی کے تمام اثرات ملتے ہیں اور یہ اس تحریک کے سب سے بڑے آئینے ہیں۔ ان افسانوں کے ذریعہ سے حقیقت نگاری، نفسیاتی تخلیل، سماجی تنقید، سیاسی مصوری جنسی مسائل کی عکاسی، انسانیت کا حسن اور انسانیت کے زخموں کا حسن، کچھ ہوئے درماندہ لوگوں کی بلندی اور اوپری اثاریوں کی ذہنی پستی کا ثبوت دیا گیا ہے۔“^۱

ترقبی پسند تحریک نے نئے افسانے کو نفسیات اور خاص کر جنسی نفسیات کا ترجمان بنایا۔ اس سے افسانوں میں تازگی آئی۔ ایک خوشگوار فضنا پیدا ہوئی اور یہ بات بھی دیکھنے میں آئی کہ اکر شریک جنسی مسائل کو پیش کرنے میں ہمارے افسانہ نگاروں کے باٹھ کا ناپ گئے۔ لذتیت جھلکنے لگی کیونکہ انہوں نے اپنے افسانوں کی بنیاد صرف مشاہدے پر رکھی تھی لیکن زیادہ تر افسانہ نگاروں نے

^۱ تنقید کیا ہے؟ پروفیسر آل احمد سرور۔ ص 141

توازن سے کام لیا اور فن و اخلاق دونوں کو مجروح نہیں ہونے دیا۔
 یہ وہ محرکات تھے جو ڈاکٹر شفیق الرحمن کی افسانہ نگاری کے زمانے میں
 پورے ماحول پر انداز ہو رہے تھے اور انہی کے دوران ڈاکٹر شفیق الرحمن
 نے اپنے افسانوں کا تانا بانا تیار کیا۔ دراصل یہی وہ حالات تھے جن کے تحت
 ڈاکٹر شفیق الرحمن نے ایک خاص انداز سے سوچنے اور مخصوص نقطہ نگاہ سے
 اپنے افسانوں کو پیش کرنے کی تینک کو برتا۔ جس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی
 نصیب ہوئی کیوں کہ انہوں نے ماحول اور وقت کو بدلتے حالات کے تحت
 اپنے افسانوں میں ایک کھلنڈے بھیرو، جو معاشی فکر وہ سے آزاد ہے، کو اپنا
 موضوع بنایا اور اس کے بیان کے لیے اتنا بھی دلکش اسلوب بھی اختیار کیا۔ جس
 سے ان کے افسانوں میں وہ جدت اور دلکشی پیدا ہوئی کہ ہر کوئی ان کا دیوانہ
 بن گیا۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اعلیٰ متوسط طبقے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔
 آزادی سے پہلے کے ادب میں اس طبقے کو بالکل بھی نظر انداز کر دیا گیا تھا، بات یا
 تو بادشاہوں کی ہوتی تھی یا غریبوں کی یا پھر جن، پری یا بھوتوں کی۔ ترقی پسندوں
 نے مزدوروں اور کسانوں کو اپنا موضوع بنایا۔ لیکن ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اعلیٰ
 متوسط طبقے کے ماحول کو اپنے افسانوں کے لیے منتخب کیا اور بڑی جسارت سے
 اس زندگی کی خامیوں اور خوبیوں کو پیش کیا۔ ساتھ ہی اس طبقے کے مشاغل کا بھی
 ذکر مزاحیہ انداز میں اس طرح کیا کہ بات کھل کر سامنے بھی آگئی اور کسی کو ناگوار
 بھی نہیں گزری۔ بقولِ پروفیسر آفاق احمد۔

”جس حد تک ڈاکٹر شفیق الرحمن کی مزاح نگاری کا تعلق ہے
 میں بھی اس کا گردیدہ ہوں اور اسے ہندوستان و پاکستان کا

واحد ادیب سمجھتا ہوں جو ہمارے Upper Middle class
 کے گھریلو اور بیرونی ماحول کی نہایت عمدگی اور سچائی کے

ساتھ اپنے مزاحیہ رنگ میں پیش کر رہا ہے۔ ۱۷
 ڈاکٹر عبادت بریلوی بھی قرۃ العین حیدر اور ڈاکٹر شفیق الرحمن کو ایسے افسانے نگاروں میں شمار کرتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے افسانوں میں اعلیٰ متوسط طبقے کی زندگی اور مسائل کو پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک ۱۸

”شفیق الرحمن اس سلسلے میں پیش پیش ہیں۔ شفیق الرحمن کے افسانوں میں بھی اس طبقے کی زندگی کے پلے پھلے پہلوؤں کی ترجیحی ہے۔ انھوں نے اس اونچے طبقے کے افراد کی کھوکھلی محبت اور جذباتی روانیت کو پیش کیا ہے۔ وہ بھی اسی ماحول میں کھوئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔“ ۱۹

جبکہ تک ڈاکٹر شفیق الرحمن کے ادبی دنیا میں داخل ہونے کے محرکات کا تعلق ہے تو وہ اپنے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں:

”میری والدہ کے پاس اردو کے بہت سے رسائل آتے تھے جن میں ”عصمت“، ”تہذیب نواں“ اور ”سیلی“ کے نام مجھے یاد ہیں۔ وہ میں پڑھا کرتا تھا۔ انھیں پڑھ پڑھ کر مجھے بھی لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ مجھے جب لکھنا پڑھا گیا تو والدہ نے میرے لیے ”رہنمائے تربیت“ رسالہ لگوادیا۔ پہلی کمائی بچپن میں اسی رسالے کے لیے لکھی۔ جو شائع بھی ہو گئی تو حوصلے بلند ہو گئے اور میں نے باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا۔“ ۲۰

اس سلسلے میں جو دیگر ثوابد ملتے ہیں۔ ان میں محمد خالد صاحب کا مضمون بہت اہم ہے۔ جو ”نقوش“ لاہور کے شخصیات نمبر میں شائع ہوا تھا۔ آپ کیوں کہ ڈاکٹر شفیق الرحمن کے بچپن کے دوستوں میں سے ہیں اور آپ کے

۱۷۔ وہ نہست مسیدیہ مکن، مسیدیہ بنی ہمود، بھوپال۔ ص ۱۱۷۔ اردو تنقید کا ارتقا۔ عبادت بریلوی۔ ص 324۔

۱۸۔ شکوفہ حیدر آباد دکن، فوری ۱۹۸۸۔ ص 43۔

مضمون سے اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ آپ ڈاکٹر صاحب کو بہت قریب سے جانتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو بچپن سے ناول پڑھنے کا بہت شوق تھا اور یہی شوق ان کے لکھنے کا بھی باعث بننا۔ محمد خالد صاحب لکھتے ہیں:

”بازار میں ایک دوکان تھی۔ جہاں چاند تارے کی شکل کی چوپسے والی مسٹھائیوں کے علاوہ فضل بک ڈپو کے ناول بھی شاید ایک روپیہ یومیہ پر کرائے پر مل سکتے تھے۔ شفیق کے توسط سے میں بھی ان ناولوں سے متعارف ہو گیا اور رفتہ رفتہ ان کا رسیا بن گیا۔ ہم ان ناولوں کو کلاس میں لے کر آتے اور ماسٹر کی موجودگی میں انہیں ڈسک کے نیچے چھپا کر پڑھتے۔۔۔۔۔ جب ماسٹر جماعت میں سود یا تجارت کی گتھیاں سلجھا رہا ہوتا۔ ہم بڑے مزے سے اپنی تہ خانوں اور نقاب پوشوں کی دنیا میں گم ہوتے۔ ہم دونوں کو پڑھنے کی عادت ان بھی ناولوں نے ڈالی۔ ہم ان جاسوسی ناول لکھنے والوں کی ذہانت اور قابلیت پر رشک کیا کرتے۔ ان مصنفوں کے ناموں میں ہمیں ایک شان، ایک عظمت نظر آتی اور ہم دونوں کے دلوں میں اس ارادے نے پہلی بار جڑ پکڑی کہ ہم بڑے ہو کر مصنف بنیں گے۔۔۔۔۔

جناب شریم اکرام الحق صاحب کے ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر شفیق الرحمن فرماتے ہیں کہ:

”افسانہ نگاری 1936 میں باقاعدگی سے شروع کی۔ اس وقت میں کلیع میں پڑھتا تھا۔ نیرنگ خیال اور دوسرے ادبی پرچوں میں میرے مضامین شائع ہوتے تھے۔ افانے لکھنے کیوں شروع

کے۔ اس کا بہب شاید یہ تھا کہ گرد و پیش میں ایسے کردار تھے جنہیں دیکھ کر لکھنے کی تحریک ہوتی تھی۔ لکھنے لکھانے کا چسکا تو بچپن سے ہی پڑھ کا تھا، جب ارد گرد موضوعات بھی بہت سے ملے تو افسانے لکھنا شروع کر دیے۔ "شیطان" میرا بڑا مشور کردار تھا۔ یہ میرا ایک دوست ہے۔ جو آج کل U.S.A میں ہے۔ کبھی آیا تو آپ سے ملاوں گا۔ بیکم اختر ریاض الدین کا دیور ہے اور حکومت آپ ان کی بہن ہیں یہ دو افسانوں کے ایسے کردار تھے جو بہت مشور ہوئے۔

اس طرح ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اپنے آس پاس کی زندگی سے متاثر ہو کر افسانے لکھنا شروع کیے۔ آئے دن پیش آنے والے واقعات کو مزاحیہ جملوں میں ڈھال کر اس طرح پیش کیا کہ ان میں ایک جان سی پڑگئی اور وہ زندگی سے اتنے قریب ہو گئے کہ قاری کو احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ کوئی افسانہ پڑھ رہا ہے۔

اپنے طالب علمی کے زمانے میں ڈاکٹر شفیق الرحمن نے ایک انگریزی کے مصنف "لی کاک" کا مطالعہ کیا اور اس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسی کے انداز پر مزاحیہ افسانے لکھنے لگے۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن "لی کاک" کے اس قدر گرویدہ تھے کہ جب کسی کھونمنے جاتے تو وہ "لی کاک" کی کوئی نہ کوئی کتاب ضرور ساتھ رکھ لیتے اور باغ کی کھلی فضنا میں بیٹھ کر اس کتاب کا لطف اٹھاتے اور تھقے لگاتے۔ یہ بات بھی محمد خالد صاحب نے بہت تفصیل سے اپنے مضمون میں بیان کی ہے۔

غرض اس مختصر سے جائز سے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر شفیق الرحمن کی افسانہ نگاری بتدریج ارتقا پذیر رہی ہے۔ انسوں نے ابتدا "المرا" کی کہانیوں کے آزاد ترجمے سے کی جو "عصمت" لاہور وغیرہ رسائل میں شائع ہوئے۔ پھر

افسانوں کی طرف متوجہ ہوئے تو رومانیت کے ساتھ مزاح اور حزن کے ملے جلے
تاشر نے دھڑکتے دلوں میں ایک جان ڈال دی لیکن زیادہ دنوں تک یہ افسانوں کا
سلسلہ قائم نہ رہ سکا اور دجلہ، نیل اور ڈنیوب وغیرہ چیزیں پیش کیں۔ جن میں
حقیقت نگاری کے ساتھ مزاحیہ انداز سے ایک ایسا امتراج اور ایک نیارنگ پیدا
کیا جوان بی کا حصہ ہے۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن نہ صرف ایک اچھے افسانہ نگار ہیں
 بلکہ ایک اچھے طنز نگار اور مزاح نگار بھی ہیں۔ آپ کے افسانوں میں اعلیٰ درجے
کے طزو مزاح کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ کردار اعلیٰ خاندانوں سے تعلق
رکھتے ہیں اور ان کی بہو تصویر شخصی کر رکھ دیتے ہیں۔۔۔۔۔ بلاخوف تردید کہا
 جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر شفیق الرحمن کی افسانہ نگاری ہمارے افسانوی ادب میں
 ایک خوشنگوار انسان ف کی حیثیت رکھتی ہے۔



ڈاکٹر شفیق الرحمن

کی شخصیت کے اہم پہلو

ڈاکٹر شفیق الرحمن کا پورا نام راؤ شفیق الرحمن ہے۔ آپ کا تعلق موجودہ صوبہ ہریانہ کے شہر روہتک سے ہے۔ آپ راجپوت گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اپنے نام کے آگے راؤ لگاتے ہیں۔ آپ نے میرک تک کی تعلیم بہاول پور میں حاصل کی۔ اس کے بعد روہتک کلنج میں داخلہ لیا۔ جہاں سے F.S.C کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ اس کے بعد لاہور کے کنگز ائیورڈ میڈیکل کلنج میں داخل ہوئے اور 1941 میں پنجاب یونیورسٹی سے M.B.B.S کی ڈگری حاصل کی۔ آپ کے شوق اور ایڈونچرス طبیعت کی بنا پر آپ نے فوج میں ڈاکٹر بننا پسند کیا۔ ان دنوں دوسری جنگ عظیم چل بی رہی تھی اور فوج میں ڈاکٹروں کی ضرورت بھی تھی۔ اس لیے جیسے جیسے ہی آپ نے درخواست دی فوراً ملازمت مل گئی۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن کے بچپن کا خاکہ کھینچتے ہوئے ان کے بچپن کے دوست محمد خالد فرماتے ہیں:

”شفیق اور میں قریب قریب ہم عمر ہیں۔ ہم نے ایک جی ماہ

اور سال میں اس خوبصورت اور حیران کن دنیا میں آنکھیں کھولیں۔ ان دنوں کا شفیق ایک گول لڑکا تھا۔ جو ترکی نوئی پہنچا تھا اور ایک چھوٹے بچے کی طرح سائیکل پر چڑھ کر اسکوں آتا تھا۔ وہ فضل بک ڈپ کے سنی خیز اور راتوں کی نیند حرام کر دینے والے جاسوسی نادلوں کا بڑی شدت سے مطالعہ کیا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے۔ بچپن کی خود فرمی سے اپنے آپ کو بھی ایک ماہر جاسوس سمجھتا تھا۔ وہ اکثر سائیکل پر خیالی ڈاکوؤں یا مجرموں کا تعاقبت کیا کرتا اور اپنی کار کر دگروں کی لمبی محیر العقول کہانیاں ساتا۔ جو ہمیں ان کی خوش قسمتی پر رشک کرنے پر مجبور کر دیتیں۔ ۱۱

جاسوسی نادلوں کے مطالعے نے ڈاکٹر شفیق الرحمن کو مصنف بنادیا۔ وہ خود فرماتے ہیں:

”میں جو کچھ بھی ہوں۔ ان ہی کتابوں کی بدولت ہوں۔ انہوں نے ہمیں اصل ادب کے حسن اور لطافت سے روشناس کیا اور ہمارے تخيیل کو جلا بخشی۔ ۱۲

آپ نے 1936 سے باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ دھیرے دھیرے مقبولیت کی منزلیں طے کرتے گئے۔ 1941 میں جس سال آپ نے M.B.B.S کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ ”کرنیں“ بھی منظر عام پر آیا۔ خاص بات یہ ہے کہ افسانوی ادب کی جانب آپ کا جھکاؤ اور شرت کا اثر آپ کی پڑھائی پر بالکل نہیں پڑا۔ آپ نے تعلیم کے حصوں سے کبھی جی نہیں چرا یا۔ اور ہر سال اچھے نمبروں سے پاس ہوتے رہے۔ بقول صفائی الدین صدقی:

”شفیق الرحمن نے افسانہ نویسی کا آغاز ایک مشغلہ کے طور پر

کیا تھا۔ اس کا ارادہ ایک پیشہ ور ادیب بننے کا ہرگز نہیں تھا
کیونکہ بہت پہلے جی سے اس نے اپنی زندگی کی ایک الگ راہ
تعین کر لی تھی۔ وہ ایک ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ جسمانی روگوں کا
علالج کرنے والا ایک کامیاب طبیب، چنانچہ وہ اپنے اس مقصد
میں کامیاب بھی ہوا۔^۱

”کرنیں“ کا دیباچہ اردو کی مشور افسانہ نگار حجاب امتیاز علی نے لکھا ہے۔
جس میں وہ فرماتی ہیں:

”شفیق الرحمن صاحب کے افسانوں سے اندازہ لگایا جاسکتا
ہے کہ وہ بڑے بہر لعزیز ڈاکٹر نہیں گے اور خواتین و اطفال
میں خصوصیت سے پسند کیے جائیں گے۔ جو ڈاکٹر افسانے ایسے
خوشگوار اور مفرج لکھ سکتا ہے۔ اس کے قلم سے کوئی تلحظہ نہ
نکلن مشکل ہی نہیں۔ ناممکن ہے اور ایسا ڈاکٹر اس زمانے میں
کمیاب بلکہ نایاب ہے۔^۲“

بقول محمد خالد صاحب وہ لڑکیوں میں بہت مقبول تھے اور ان کے
افسانوں کی طرح ان کے عشق کے چرچے اکرث دوستوں میں رہا کرتے تھے:
”اس نے اپنی ایک پیر و ڈی ”قصہ حاتم طانی“ میں بہت سی
مردوں کے درمیان حاتم طانی کی ذہنی کیفیتوں کا جو نقش
کھینچا ہے۔ وہ اس کے حسب حال ہے۔ اس میں ایک مقام پر
حاتم طانی کو ایک حور شامل، ناز نہیں دکھانی دیتی ہے۔ وہ والہاں
اس کا عاشق زار ہو کر اس کی سمت چل پڑتا ہے۔ اتنے میں راہ
میں اُسے ایک اور بوش رہا حسین نظر آتی ہے۔ وہ فوراً پہلی

^۱ شاہراہ دہلی۔ ستمبر 1958۔ ص 11212

^۲ لرنیں۔ لاہور۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص 10

کو چھوڑ کر دوسری کے بجھے ہولیتا ہے۔ راستے میں اسے ایک
تمیری عشوہ طراز جاتی ہوئی ملتی ہے۔ حاتم طانی فوراً اس پر
بزار جان سے عاشق ہو جاتا ہے اور عشقِ صادق کا دم بھرنے
لگتا ہے۔ ۱۴

جناب محمد خالد اپنے ڈاکٹر شفیق الرحمن کی جوانی کے دنوں کی داستان یوں
بیان کرتے ہیں:

"شفیق نے "ندو جزر" لکھ کر "ج" کے کنبے سے انتقام
لیا۔ "ندو جزر" کی سب کہانیوں میں وہ خود بیروہ میں مسجد
بیروہ اس کے نام مختلف اور کہانیاں بھی مختلف ہیں مگر وہ
حقیقت میں ایک بی لڑکی ہے) کے کنبے کے بعض
قابلِ اعراض افراد کے تھب نیل خاکے۔ تیکھی اور لطیف طنز
کے شاہکار ہیں۔ "ندو جزر" "ج" کے نام ایک
شعر کے ساتھ منوب کی گئی ہے۔ جس میں "ج" سے غیروں
سے کنبے بننے کا شکوہ کیا گیا تھا۔ اس نے کتاب کی دو جلدیں
تحفہ "ج" کے باہم بھجوادیں۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ
آیا "ج" کے کنبے والوں نے "ندو جزر" کے مختلف کرداروں
کے روپ میں اپنے کو پہچانا یا نہیں۔ البتہ یہ یقین
ہے کہ ان کا انداز اس کے بعد سخت ہو گیا "ج" کے ساتھ
شفیق کی نسبت کے پر سپیکٹ بالکل مذہم ہو گئے۔ ۱۵

ڈاکٹر شفیق الرحمن نے راولپنڈی سے جناب صفائی الدین صدیقی کو ایک
خط 16 مارچ 1949 میں لکھا تھا۔ اپنے عشق کے داستانوں کی تصدیق کی تھی۔
بعقولِ صفائی الدین صدیقی:

۱۴ نوش، لاہور، شخصیات نمبر ص 455 ۱۵ نوش، لاہور، شخصیات نمبر ص 454

"شفیق الرحمن کی اکرٹھمانیوں کے بھی کوئی نہ کوئی حسین شخصیت ضرور چھپی ہوئی ہے اور اس بات کا اعتراف اس نے صاف لفظوں میں کیا بھی ہے:

"آپ کا خط فروری میں مل گیا تھا لیکن اس میں میرا وہ حال تھا..... یار و محبے معاف کرو میں نہ میں ہوں۔" ایک صاحب دلی سے یونہی آئے ہوئے تھے۔ یہ وہی صاحب تھے جنہوں نے "پچھاؤے" لکھوا یا تھا ان کے آنے سے 1949 ختم ہو گیا اور 1954 شروع ہو گیا۔ اپنے لوگ بھی تو اسی طرح گنتے تھے 1949 سے لے کر 1945 عیسوی قبل از مسیح بس بالکل اسی طرح ہوا۔ بالکل وہی باتیں وہی جذبات وہی حرکتیں۔ یہاں تک کہ حلیہ بھی اسی قسم کا ہو گیا۔ الحمد للہ کہ اب رو بسحت ہوں۔۔۔ امید ہے کہ ایک ممینے تک محبے کمکل شفا ہو جائے گی۔۔۔ ایک اور صاحب کے متعلق میں سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا۔ اب پس پرده چلے گئے ہیں۔۔۔

یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر شفیق الرحمن نے شادی بست لیٹ کی یعنی 39 سال کی عمر میں۔ جب بھی چھٹیوں میں گھر تشریف لاتے۔ بھاؤ جس اور بہنسیں اصرار کرتیں مگر آپ ہمیشہ ٹال جاتے۔ لیکن ان کا اصرار جاری رہتا۔ ایک انشرویوں میں جناب فرید احمد صاحب کے ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

"بھاؤ جس اور بہنسیں شادی پر اصرار کرتی تھیں تو ہم ناراض ہو جاتے تھے۔۔۔ ایک دفعہ تو میں نے ان سے سخت ناراضگی کا اظہار کر دیا۔ نہ جانے کیوں ایسا ہوا۔۔۔؟ کئی ماہ عزیزوں سے ناراضگی رہی۔ پھر ایک طویل وقٹے کے بعد وہ سب آکیں۔"

میرے منہ سے بلحے شاہ کا یہ مصرعہ نکلا:

”نوں مناوں آیاں بھیڑاں تے بھر جائیاں۔“

”بلحے شاہ کو منانے بہنسیں اور بھاؤ جیں آگئیں۔“ - اس کے بعد نہ جانے کیا مزاج یہ تبدیلی آئی اور ان کی بات یاد لی گئی۔
ہماری شادی ہو گئی۔ ہماری عادتیں بڑی غمیب تھیں۔ بے ترتیب سی عادتیں، ہم نے سوچا اب یہ عادتیں جاتے جاتے جائیں گی۔ لہذا اپنی کمزوریوں کا اعتراف کر لیا تو قدرے ذمے دار زندگی گزر گئی۔۔۔

فوج میں ملازمت کے دوارن ڈاکٹر شفیق الرحمن مختلف مقامات پر رہے اور وبا سے برابر اپنے دوستوں کو خط لکھتے رہے۔ یہ تمام خطوط آپ کی بے تکلف اور دلپس پ طرز تحریر کے بہترین نمونے ہیں۔ ان ذاتی خطوط کا ذکر محمد خالد صاحب کے مضمون میں بھی ہے لیکن جناب صنی الدین اپنے مضمون میں دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے پاس ڈاکٹر شفیق الرحمن کے سو سے زیادہ خطوط محفوظ ہیں۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے دوستوں کو پابندی کے سے خطوط لکھتے تھے جن میں ذاتی مسائل کے علاوہ ادب اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تبادلہ، خیال کیا جاتا تھا۔ بقول صنی الدین سعدی:

”یہ ضرور ہے کہ تعلیم کے بعد ہمارے درمیان مراسلت کی رفتار کافی سست پڑ گئی۔ لیکن اس کے باوجود میری فائل میں اس کے ایک سو سے زائد خطوط محفوظ ہوں گے۔ یہ تمام خطوط اکم از کم میرے نزدیک معمولی قسم کے نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کی ایک ایک سطر پر مجھے شفیق الرحمن کی شخصیت کی

گھری چھاپ نظر آتی ہے۔^۱
 ایک خط کا اقتباس ملاحظہ فرمائے جو ڈاکٹر شفیق الرحمن نے 30/ دسمبر
 1948 کو جانب صفائی الدین صدیقی صاحب کو لکھا تھا:

”میں تو ابھی تک یعنی پلر ہوں اور ویسا بی ہوں، جیسا پہلے تھا۔

میرے خیال میں اب Chronic Bachelor ہو گیا ہوں۔۔۔۔۔

لاہور میں شیطان سے ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ سن کر بڑا

افسوس ہوا کہ شیطان کا ارادہ شادی کرنے کا ہے۔ شاید ویے

شادی سے کوئی فرق نہ آتا لیکن جو لڑکی انہوں نے منتخب کی وہ

یقیناً انہیں شیطان سے آدمی بنادے گی۔^۲

ڈاکٹر شفیق الرحمن بھی بھی اپنے پیشے سے غافل نہیں رہے اور برابر اعلیٰ
 تعلیم کے لیے کوشش رہے۔ آپ کو 1951 میں لندن جانے کا موقع ملا تو وہاں سے
 ایک اور میڈیکل کی ڈگری D.T.M & H لے کر آئے۔ پھر پاکستان سے
 F.C.P.S. کی ڈگری حاصل کی۔۔۔۔۔ ہمیشہ اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ملازمت
 1942 میں برٹش انڈین آرمی سے شروع کی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران
 مختلف محاذاوں پر رہے۔ قیام پاکستان کے بعد 1948 میں آزاد کشمیر اور 1965 میں
 چاؤندہ سیال کوت کے محاذ پر رہے۔ اس کے بعد آرمڈ نور سریز میڈیکل کلیعے کے
 پرنسپل مقرر ہوئے، بعد میں پاکستان نیوی میں بطور ڈائریکٹر میڈیکل سرویسز کے
 عہدے پر فائز ہوئے۔ آپ کو 1978 میں ”بلال امتیاز“ کے خطاب و تمغہ سے
 نوازا گیا اور آخر میں جب آپ ریٹائر ہوئے تو 1979 میں آپ سرجن ایئر ایئر میل
 کے عہدے پر فائز تھے۔۔۔۔۔ پھر ڈھانی سال تک اپنے لکھنے میں وقت
 صرف کیا۔ آپ کی ادبی خدمات کو بد نظر کھتے ہوئے حکومت پاکستان نے آپ کو

شفیق الرحمن خطوط کے آئینے میں۔ صفائی الدین صدیقی۔ شاہراہ دہلی۔ ستمبر 1958۔ ص 11۔

شفیق الرحمن خطوط کے آئینے میں۔ صفائی الدین صدیقی۔ شاہراہ دہلی۔ ستمبر 1958۔ ص 14۔

1981 میں اکادمی ادبیات پاکستان کا چیئرمین مقرر کیا۔ اس عہدے پر آپ نے 5 سال تک کام کیا۔ آج کل آپ راولپنڈی میں قیام پذیر ہیں اور اپنا سارا وقت لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے ہیں۔ آپ نے میرے ایک خط کے جواب میں تحریر کیا ہے کہ اس دوران جو افسانے اور مضمون مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں، ان کو ترتیب دے رہا ہوں اور بہت جلد ایک اور کتاب میری منظر عام پر آجائے گی۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اپنا بہت سا وقت اردو ادب کی خدمت میں صرف کیا۔ لیکن وہ کبھی اپنے پیشے سے غافل نہیں رہے۔ انہوں نے زندگی ایک خاص اصول کے تحت بسر کی۔ ان کے مزاج اور اصولوں میں اتنی یگانگت پائی جاتی ہے کہ اس کو بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ مثلاً پڑھنے کے وقت آپ پڑھتے تھے۔ کھیل کے اوقات میں آپ صرف کھیلتے تھے۔ اور اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کا بھر پور فائدہ اٹھاتے تھے۔ یہ سب اسی کی دین ہے کہ وہ ایک بہترین ڈاکٹر ثابت ہوئے۔ خدا نے ان کے با吞ہ میں شفا بخنسی تھی۔ اس لیے اپنے مریضوں میں بے پناہ مقبول رہے۔ شوق مزاج اور چنپل طبیعت کی وجہ سے اپنے احباب میں بے حد پسندیدہ نظرؤں سے دیکھے جاتے رہے اور اردو ادب میں آپ کا شمار بہترین مزاحیہ افسانہ نگار کی حیثیت سے ہوتا ہے۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن کو کھیلوں میں کرکٹ کا کھیل سب سے زیادہ پسند ہے۔
بعقول محمد خالد صاحب:

”کلئے کے دنوں میں انہیں اچھا خاصہ فاسٹ باولر سمجھا
جاتا تھا۔“^۱

یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر افسانوں میں کرکٹ کا ذکر کسی نے کسی صورت میں ضرور ملتا ہے۔ شمیم اکرام صاحب کے ایک سوال کے جواب میں

^۱ نقوش لاہور۔ شخصیات نمبر ص 450

خود فرماتے ہیں:

”کھلیوں سے بڑی دلچسپی رہی ہے، کرکٹ، تیسرے کی خاص مشغله رہا ہے۔ باکنگ میں بھی کلر لیے ہیں۔ کرکٹ کا بڑا شیدائی ہوں۔“^۱

ڈاکٹر شفیق الرحمن بست سوچ سمجھو کر، غور و فکر کے بعد قلم انٹھاتے ہیں۔ دنوں ایک بھی موضوع کو اپنے دل و دماغ میں بساتے ہیں، اس لیے انھیں زود نویس نہیں کہا جاسکتا۔ ابتدائی دور میں ان کی رفتار ضرور کچھ تیز رہی لیکن وقت اور حالات کے بدلتے کے ساتھ ساتھ مزاج میں جو تبدیلیاں آئیں، ملازمت کی مصروفیات اور گھریلو ذمہ داریوں کا اثر آپ کی زندگی پر بڑا جس کے نتیجہ میں آپ نے کم لکھا۔ مگر جو کچھ لکھا وہ زندگی اور حقیقت سے بھرپور ہے۔ جانب محمد خالد فرماتے ہیں:

”شفیق سمل نویس نہیں ہے۔ جیسا کہ اس کی نظر کی بے ساختہ روانی سے کئی ایک کو گماں ہو گا۔ اس نے آج تک کوئی چیز قلم برداشتہ یا ایک نشست میں نہیں لکھی۔ جب کسی چیز یا کہانی کے جراشم اس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں تو وہ اس پر اچھی طرح سوچتا ہے اپنے دوستوں سے مشوروں کی خاطر، اس پر بحث کرتا ہے۔ اپنی کافی بک کے بیسوں صفحے کرداروں، اپنے کیوں اور پلات کے ارتقا کے مختلف ممکنات سے سیاہ کر ڈالتا ہے۔ کئی کئی ہفتے وہ ایک بھینس کی طرح ”آئیڈیا“ کی جگآل کرتا رہتا ہے اور جب تک اسے پورا اطمینان نہیں ہو جاتا، وہ اصل کہانی لکھنا شروع نہیں کرتا۔“^۲

۱۔ شلگوف، حیدر آباد، فروری 1988

۲۔ نتوش، لاہور، شخصیات نمبر 454، 453 ص

اس بات کا اعْرَاف خود ڈاکٹر صاحب نے فرید احمد صاحب کو انڑو یو
دیتے ہوئے کیا ہے۔

"لکھنے کے لیے پڑھنا ضروری ہے۔ محنت سے لکھنا چاہیے۔"

شوخی بھی درکار ہوتی ہے۔ باں! میں نے جب بھی لکھا۔

دوسروں کو ضرور دکھایا۔ خصوصاً کتاب جھانپنے سے پہلے۔

اسے بار بار خود پڑھا۔ پھر دوسروں کو دکھایا تو تشقی ہوتی۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ میں جب بھی کچھ لکھتا ہوں محمد خالد کو ضرور دکھاتا ہوں۔

"دجلہ" میں انہوں نے کہا کہ کئی جگہ تکرار ہے۔ ایک لفظ تین

تین دفعہ لکھ دیا ہے۔ میرے ان کی اصلاح قبول کی۔ میرا خیال

ہے کہ لکھنے اور پختہ تحریر لکھنے کے لیے پڑھنے خلوص سقم بتائیں۔

اس میں کچھ نہیں جاتا اور ادبی وضع کا تقاضہ یہی ہے۔۔۔۔۔

جانب شمیم اکرام الحق کو انڑو یو دیتے ہوئے ڈاکٹر شفیق الرحمن نے
بڑے دلپس پ اور عجیب و غریب اکتشافات اپنے لکھنے کے بارے میں کیے ہیں۔
جو ایک عام شخص کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

"سہ۔ آپ لکھتے کس وقت ہیں۔"

نجی۔ عموماً صبح کے وقت لکھتا ہوں۔ میرے لکھنے کا انداز بڑا

عجیب ہے۔ میں کھڑے ہو کر لکھتا ہوں۔ پڑھتا بھی کھڑے ہو کر

ہوں۔ اپنے کمرے میں ڈائیس رکھا ہوا ہے۔ اس پر کاغذ، پینسل،

ربڑ تمام ضروری چیزیں بہ وقت موجود رہتی ہیں۔ جب مودہ بنتا

ہے۔ لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ جو پسند نہ آئے۔ مٹا دیتا ہوں۔

دوبارہ لکھتا ہوں۔ پھر اپنے لکھنے کو دوسرے دن پڑھتا ہوں اور

جو خامیاں نظر آئیں ان کو درست کرتا ہوں۔ اس کے بعد

اشاعت سے پہلے محمد خالد اختر کو دکھاتا ہوں۔ وہ میرا بڑا زبردست نقاد ہے۔

مگر کھڑے ہونکر آپ کیے لکھتے ہیں۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ تو جنرل صاحب بنس کر بولے۔ بس جیسے کھڑے ہو کر لکھتے ہیں۔ میں تو اپنا ڈائیس محاڑ جنگ پر بھی ساتھ لے جاتا ہوں۔ ایک بار 1965 کی جنگ میں میری ڈیوٹی کھاریاں کے محاڑ پر تھی۔ میں وباں ڈائیس ساتھ لے گیا اور درختوں کے نیچے رکھ دیا۔ خندقوں کے قریب بی رکھا تھا۔ جب فرصت ملتی لکھنے کھڑا ہو جاتا۔ جب سائرن بجتا خندق میں کوڈ جاتا۔ میں سلدہ پندرہ دن تک جاری رہا۔ جنگ ختم ہونے سے دو دن پہلے ہمارے کمانڈر معافی کے لیے آئے تو دیکھ کر بہت ناراض ہوئے۔ کہنے لگے تم نے یہ کیا تماشا بنارکھا ہے؟۔۔۔۔۔

جب میں اکاذیمی کا چیسر میں تھا تو میں نے وباں بھی اپنے دفتر میں ڈائیس رکھا ہوا تھا۔ لکھنے پڑنے کا سارا کام میں اسی پر کھڑے ہو کر کرتا تھا۔۔۔۔۔

یہ ہیں ڈاکٹر شفیق الرحمن جن کی شخصیت کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ کیوں کہ ان کے کئی روپ ہیں۔ شوکت تھانوی صاحب نے ان کی شخصیت کا تجزیہ کچھ ان الفاظ میں کیا ہے:

”ادب اور فوج، تحریمیٹر اور وردی، ذوقِ سلیم اور کورٹ مارشل، مزاح لطیف اور کوئی مارچ۔۔۔۔۔ اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ایک میر پر قلم، روپالور اور تحریمیٹر تین مختلف چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ ان تینوں کو اگر

طبِ یونانی کے ماہروں کی اصلاح میں (سامیدہ حل کر دہ) کی
کیشیات سے گزارا جائے تو یہ تمیوں مل کر ایک شفیق الرحمن
پسیدا کر دیں گی۔ ۱۶

ڈاکٹر شفیق الرحمن ایک صاحبِ طرز ادیب میں مزاح نگار ہیں۔ ایک ڈاکٹر
ہیں۔ ایک فوجی افسر ہیں۔ اب وہ فوجی زندگی سے سبک دوش ہو چکے ہیں۔ آج
تک اردو ادب کے شالقین انھیں کرنل شفیق الرحمن کے نام سے یاد کرتے
ہیں۔ حالانکہ وہ ترقی کر کے مجرم جزل اور ایڈرل کے عہدوں تک پہنچ چکے لیکن
مزاحیہ افسانہ نگار کی حیثیت سے جہاں بھی آپ کو یاد کیا جاتا ہے تو کرنل کا لفظ
ساتھ لگا ہوتا ہے۔ اور لوگ حیران ہو کر دریافت کرتے ہیں۔ وہی کرنل شفیق
الرحمن کرنیں۔ پچھتاوے اور شکوفے والے۔



ڈاکٹر شفیق الرحمن

بھیتیت افسانہ نگار

ڈاکٹر شفیق الرحمن کا شمار ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے کیونکہ آپ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اس وقت کیا جب ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی۔ آپ کے افسانے مختلف رسائل میں شائع ہو رہے تھے لیکن آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ "کرنیں" 1941 میں منظرِ عام پر آیا اور بہت جلد آپ نے مقبولیت کی تمام منزلیں طے کر لیں۔ آپ کا ہر افسانہ ایک نئے انداز کا حامل ہوتا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ اس میں آپ کی اپنی شخصیت ضرور جھلکتی ہے۔ یہ انداز ڈاکٹر شفیق الرحمن سے پہلے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں نہیں ملتا ہے جو بالکل بھی نیا اور جدا گانہ انداز ہے بقول حجاب امتیاز علی:

"ان کے ہر افسانے کے طرز اور انداز بیان سے ان کی اپنی شخصیت کا انکشاف ہوتا ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں کی دلاؤیزی صرف ان کی اپنی شخصیت کی احسان مند ہے، جو ان کے تمام افسانے پر ایک بے ساختگی کی طرح چھائی ہوتی ہے۔"

جو لوگ مجھے چند سالوں میں اردو کے ادبی رسائل کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ وہ ان کے رومانی اور تفریحی رنگ سے خوب واقف ہوں گے۔

ترقی پسند تحریک سے پہلے جو افسانہ لکھا جا رہا تھا، اس میں شہروں کی زندگی اور نوابی شان و شوکت کا کچھ ذکر زیادہ تھا، اور ادب برائے ادب اس دور کے افسانہ نگاروں کا بنیادی مقصد تھا۔ ترقی پسندوں نے آکر اس نظریہ کو یکسر بدل دیا اور کہا کہ ادب برائے زندگی ہونا چاہیے، یعنی ادب کا مقصد اور بامعنی ہونا ضروری قرار پایا اور اسی وجہ سے ترقی پسند افسانہ نگاروں نے غریب کسانوں اور مزدوروں کی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور جو افسانہ امیر گھرانوں کے چکر لگا رہا تھا، غریبوں کی جھونپڑیوں کا حال بیان کرنے لگا، جس میں مزدوروں اور غریب کسانوں کے مسائل سے بھی عوام کو روشناس کرایا لیکن ڈاکٹر شفیق الرحمن نے ان دونوں کے درمیان کارائی اختیار کیا یعنی ترقی پسندوں سے انحراف تو نہیں کیا اور افسانوں کا مقصد ادب برائے زندگی ہی رکھا لیکن مزدوروں اور کسانوں کی بات کرنے کے بجائے اعلیٰ متوسط گھرانوں کے موضوعات اور مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا، رومانس اور مزاح کی چاشنی سے اپنے افسانوں کے حسن کو دو بالا کر دیا۔

„فرض کیجئے کہ یہ گیند ہے۔ میں نے ان کی دیا سلانی کے بکس کو باتحہ میں لے کر کما دیے تو میں بہت دور سے بھاگ کر آیا کرتا ہوں مگر وکنوں کے پاس آکر گیند اس طرح پھینکتا ہوں۔ میں نے باتحہ کھایا اور ماچس کو دوسرے

دروازے پر دے مارا۔

بہت خوب یہ آواز تسمیم کی تھی۔

ملے کرنیں، ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص 7

دیکھا ابا جان آپ نے۔ اس کا نام ہے باولنگ۔ وہ پرده اٹھا کر داخل ہوئی۔ میں وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ لاحول و لا قوہ گویا یہ ایک دوستتے تک کی چھیڑ خانی میں نے خود مول لے لی تھی۔ اگلے روز میرا نام فاست باولر رکھ دیا گیا۔ گھر میں بچوں سے کہ دیا گیا کہ وہ مجھے بھائی جان کے بجائے فاست باولر کہا کریں۔

اس طرح ڈاکٹر شفیق الرحمن اعلیٰ متوسط گھرانوں کی زندگیوں کا حال اپنے افسانوں میں بیان کرتے ہیں۔ یہ وہی ماحول ہے جس میں خود انہوں نے پورش پائی ہے جسے انہوں نے قریب سے دیکھا ہے اور مزاحیہ رنگ میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن اپنے مزاحیہ انداز سے برا ایک کا مذاق بہت سنجیدگی سے اڑاتے ہیں اور طنز کے ایسے تیر چلاتے ہیں کہ قاری ان میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک جس سے خود بھی کسی نہ کسی طرح وابستہ رہے ہیں مگر اس کی جو بات ناپسند تھی اس کا جم کر مذاق اڑایا ہے۔ یعنی ترقی پسندوں نے ادب کو کئی خانوں میں تقسیم کر دیا تھا اس پر ڈاکٹر شفیق الرحمن اپنے افسانے ”یوں ہی“ میں فرماتے ہیں:

”تو پھر شاعری بیکار ہے کیا؟ ایک نے پوچھا
اجی بیکار کون مسحرا کتا ہے۔ شاعری تو بڑی کار آمد چیز ہے۔
شاعری کام آنی چاہیے۔ سرمایہ داری کے خلاف شرکسو، مزدور
کی حمایت میں غزل لکھو۔ مزدوروں کے رشتے داروں کے
متعلق۔ سماج کے ظلم کے متعلق۔ سماج کے ٹھیکیداروں کے
متعلق۔ غربلوں کے عنوان ہوں۔ مزدور کا بہنوئی۔ مزدور

کا پھوپی زاد بھائی مزدور کی ساس یا پھر سرمایہ داروں کی رعونت پر بھی دو غزلے سے غزلے لکھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً سرمایہ داروں کی مٹی ڈھونے سے انکار پر ایک بہت عمدہ غزل لکھی جاسکتی ہے اسی طرح سرمایہ دار اپنی لڑکی اور ایک مزدور کے عشق پر غصہ اور امیری و غربی میں جوتا چلنا بھی اتحے موضوع ہیں۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن کے افسانوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے افسانوں کے کردار کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں یکب، ہوش، سیر و تفریح، سینما وغیرہ جیسی چیزوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ کار، بنگلوں سے نیچے کی بات نہیں کرتے ہیں یعنی ڈاکٹر صاحب کے تمام افسانے اعلیٰ سوسائٹی کے رہن سمن اور طور طریقوں کے ترجمان ہیں:

”مجھے ان کے گھر مختہ میں کم از کم تین مرتبہ حاضری دینی پڑتی تھی اور اتوار کو صبح موڑ میں کنبے کے ساتھ کسی باہر سیر سپانے کو اور شام کو سینما ساتھ جانا ہوتا تھا۔ وقت بہت اچھا کٹ جاتا تھا۔ خال صاحب اور ان کی بیکم مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ بچے مجھ پر عاشق تھے۔ مگر جہاں یہ سب کچھ تھا دیاں میں ایک بستی سے بہت ڈرتا تھا۔ یہ ان کی بڑی لڑکی تسمیم تھی۔“

انسانی زندگی جس میں خوشیاں بھی ہیں اور غم بھی ہیں اور انسان کی زندگی کا آئینہ دار ہوتی ہیں۔ ان کا ذکر ڈاکٹر شفیق الرحمن کے افسانوں میں بہت حقیقت پسندی سے کیا گیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے اپنے مخصوص طرز تحریر اور اسلوب کے باعث خوشیوں کو زیادہ اجاگر کیا ہے۔ بہبعت غنوں کے۔

۱۔ شگوفہ ڈاکٹر شفیق الرحمن ص۔ 148
۲۔ کرنیں ڈاکٹر شفیق الرحمن ص۔ 52

لیکن انسانی فطرت کے تحت وہ غموں سے اپنا دامن نہیں بچا سکے میں۔ پھر بھی ان کی شوخی اور شرارت نے افسانوں میں ایک کھلنڈرا پن پیدا کر دیا ہے۔ جو کسی اور افسانہ نگار کے یہاں نہیں ملتا ہے۔

”رومی مجھے رضیہ کے متعلق طرح طرح کے مشورے تو دیا کرتے لیکن ہمیشہ مجھے بیزار کر دیتے۔ سب سے پہلے تو یہ سوال پیدا ہوتا کہ آخر میرے پاس کیا ثبوت ہے کہ رضیہ کو اچھا لگتا ہوں۔؟“ یقیناً کوئی ثبوت نہ تھا اس لیے یہ کیک طرفہ کارروائی قرار دی جاتی ہے۔ کسی کو پسند کرنے سے کچھ نہیں بنتا۔ جب تک کہ وہ بھی پسند نہ کرے۔ لہذا ان کے فارمولے کے مطابق میں اور رضیہ بالکل اجنبی تھے۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے کہ بھیا دنیا بہت بڑی ہے۔ کہیں اور چاکر کوشش کرو۔ رضیہ سے بھی اچھی لڑکیاں ملیں گی اور مجھے ان کی یہ بات بالکل پسند نہیں آتی۔“

لیکن ڈاکٹر شفیق الرحمن نے جہاں کسی بھی انسانی غموں اور دکھوں کا ذکر کیا ہے تو اس کی عکاسی بڑے بڑے جذباتی انداز میں کی ہے اور ان کے قلم کی شوخی، طنز اور دکھ درد میں ڈوب گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شفیق الرحمن کو حزن نگار بھی کہا جاتا ہے۔

”جب میں اسے بد صورت کتا تو بنس کر ٹال دیتا۔ لیکن پھر جیسے اسے کھو کر کے سے لگنے لگتے۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہو جاتے۔ ہونٹ لرزنے لگتے۔ آنکھیں اور بھی ڈراؤنی ہو جاتیں، دھنڈلی پڑ جاتیں۔ لیکن وہ بڑے ضبط سے

آن سور وک لیتا۔ شاید اکیلے میں نہ روک سکتا ہو۔ ”
ڈاکٹر شفیق الرحمن کے افسانوں میں چند گنے چنے مسائل نہیں میں۔
انھوں نے زندگی کو قریب سے دیکھا اور پیش کیا ہے۔ نہ بھی ان کی معلومات محدود
ہے انھوں نے ساری دنیا دیکھی ہے اور مشاہدے سے بہت چیزوں کو اپنے
افسانوں میں سویا ہے۔ جو زندگی کے مختلف رنگوں کو اپنے میں سمیٹ لیتے ہیں:

”شیطان نے میرا تعارف کرایا۔

آپ کمیونٹ میں یا سوٹلٹ؟

پتہ نہیں

تو پھر اس پریلٹ ہوں گے۔

جی نہیں۔!

تو پھر آپ میں کیا۔؟

انسان ہوں۔

آپ انسان ہرگز نہیں ہیں۔ جب تک آپ کم از کم نیشنلٹ
نہ ہوں۔

ان سب میں کیا فرق ہے۔؟

تو گویا آپ کو فرق بھی نہیں معلوم غضب خدا کا !

چچ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ ایک رائیلٹ
ایک مارکٹ سے کیوں خغا ہے؟ ایک فاشٹ ایک انارکٹ
سے اچھی طرح کیوں پیش نہیں آتا۔؟ رائیلٹ کیوں علیحدہ
ربتے ہیں۔ میرے خیال میں ہر شخص شروع میں سوٹلٹ
ہوتا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ ترقی کر کے کمیونٹ بن جاتا ہے۔ پھر
ایکوٹ..... چچ، چچ، چچ، چچ، ہمارے نوجوان کتنے بے بہرہ

میں کتنے افسوس کی بات ہے۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن اپنے ابتدائی دور کے افسانوں میں رومان پرست نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں نے انھیں بہت پسند کیا۔ مزاج کی آمسیزش نے ان کے افسانوں میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ بقول رضی الدین صدیقی:

ہر فن کار کا ایک مخصوص نظریہ محبت اور نظریہ زندگی ہوتا ہے۔ جس کا اظہار کسی نہ کسی طرح اس کی تخلیقات میں ہوتا رہتا ہے۔ محبت کی ماہیت پر افلاطون کی طرح خالص فلسفیانہ بحث بھی ہو سکتی ہے۔ اور اس کے مظہر پر ایک عامی کے نقطہ نظر سے بھی غور کیا جاسکتا ہے ڈاکٹر شفیق الرحمن محبت کو ایک تصور کے روپ میں پوچھنے کے قائل نہیں ہیں۔ اس کی رو سے محبت انسان سے کی جاتی ہے نہ کہ تصور سے۔ شفیق الرحمن کے افسانوں کے بیرو شرت چند چڑھی کے "دیوداوس" اور گوئے کے "درور" کی طرح نہیں ہیں۔ نہ وہ روایتی قصے کہ انہیوں کے عاشق کی طرح تیشہ زنی کو محبت کی معراج سمجھتے ہیں بلکہ وہ روز مرہ کی شخصیتیں ہیں جن کی زندگی میں محبت بھی ہے اور نفرت بھی۔ ناکامی اور نامرادی پر وہ غلکین ضرور ہوتے ہیں لیکن اپنی زندگی کو قنوطیت اور یاس کے حوالے نہیں کر دیتے۔ وہ محض تقدیر کا کھلونا بن کر نہیں رہ جاتے بلکہ غم جاناں کو ایک نارمل انسان کی طرح بتحمیل جاتے ہیں۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اپنے افسانوں کو دلچسپ بنانے کے لیے اکثر جگہ

۱۔ رقتی ڈاکٹر شفیق الرحمن س 162، 161، 1 (مسنونہ)
شمارہ دنی ۱۹۵۸ء۔ نمبر ۱۴، ۱۵

اشعار کی پیر و دیاں بنائے کر پیش کی میں۔ جو نہ صرف قاری کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں بلکہ افسانے کو بھی ایک نیا موز عطا کرتی ہیں۔ آپ سے پہلے کسی اور افسانہ نگار نے یہ انداز اختیار نہیں کیا۔ اس لیے عوام نے اس نے انداز کو بے پناہ پسند کیا اور آپ کی مقبولیت کا باعث بھی بنایا۔

تو کیا یہ شعر جو ابھی رہا گیا۔ غلط تھا۔؟ ایک بولا۔

تعجب ہے کہ آپ لوگ اب بھی اسے شر بی سمجھ رہے ہیں۔ ذرا پھر یہ ہے۔

ترے کوچے، اس بھانے، مجھے دن رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا۔
وہ کچھ دیر سوتتے رہے۔ پھر بولے۔

سی خیال اگر اس طرح ظاہر کیا جاتا تو بس تھا۔

اکرٹا یک چھٹی کے روز

کام جس دن کچھ نہ ہو
مانگ کر اک سائیکل

جانا کو ہے مس تیرے

ادھر پھر مژ کے یہ بھی دیکھنا

کمس

کوئی سایہ تو نہیں

اس وقت بیچھا کر رہا ہے۔

اور پکڑ لینا ترے کوچے میں پھر

بہر جواں د پر کو

ہربت دل کیر کو

یعنی بہ راہ کیر کو

اور کہنا آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں
تینگ کی باتیں کریں، تلوار کی باتیں کریں
رات پڑ جانے پچھر :

لوٹا : اس کوچے سے
کہ کسیں کوئی سپاہی روک نہ لے۔

اور پوچھے سائیکل کا لیمپ ہے حضرت کماں۔؟
یاد آتا ہے ہمیں

جانا کوچے میں ترے
اکر شاک پچھنی کے روز۔

دیکھیے کس قدر بستر چیز ہو گئی ہے۔ انہوں نے ایک فاتحانہ
انداز سے ہمیں دیکھا۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اپنے افسانوں میں مزاج سے زیادہ اور طنز سے کم
کام لیا ہے حالانکہ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور اسی لیے مزاج کے ساتھ
طنز کا عنصر آجانا ایک لازمی سی بات ہے۔ آج کے حالات میں جو بد عنوانیاں
ہو رہی ہیں اور ہمارے دفاتر میں لاپرواہی سے کام ہو رہا ہے اس کی بستریں مثال
ڈاکٹر شفیق الرحمن کے افسانے "محبوروں" سے ملاحظہ فرمائیے:

"ایک بوڑھے پینشر کی پینشن دفعتہ" بند ہو گئی۔ جنوری سے
جون تک کچھ نہ ملا۔ آخر تنگ آ کر انہوں نے خط لکھا۔ وبا سے
جواب آیا کہ کاغذات کی رو سے آپ کا کئی ماہ ہونے انتقال
ہو چکا ہے۔ اس لیے پینشن بند کر دی گئی۔ انہوں نے لکھا کہ
صاحب میں تو باقاعدہ زندہ ہوں۔ جواب آیا کہ سرٹیفیکٹ
بھیجیے یہ ضلع کشزر کے پاس گئے۔ کشزر بڑا بنسا اور سرٹیفیکٹ

لکھ دیا کہ فلاں فلاں صاحب کو اپریل سے دیکھ رہا ہوں اور
تصدیق کرتا ہوں کہ یہ زندہ ہیں۔ نئے جون کی تاریخ ڈال دی۔
پینشرز نے وہ سرٹیفیکٹ اور خط اور پر بھیج دیا۔ اگلے منٹے تم میں ماہ
کی پیشش آگئی۔ ساتھی ایک خط جس میں لکھا تھا۔ جانب من!
آپ کے سرٹیفیکٹ کے مطابق اپریل میں اور جون کی پیشش
ارسال ہے۔ برہ کرم ایک اور سرٹیفیکٹ ارسال فرمائیے کہ
آپ جنوری، فروری اور مارچ میں بھی زندہ تھے تاکہ آپ کی
بقری پیشش بھی بھیج دی جائے۔

احمد جمال پاشا آپ کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
”شفیق الرحمن“ کے یہاں زندگی اپنی بھرپور توانائی کے ساتھ
آتی ہے۔ ان کے یہاں فکر جہاں بھی ہے اور غم جاناں بھی۔
چھوٹے اور بڑے سائل کی نشاندہی بھی ہے اور زندگی کی
نامہواریوں پر خوشناطنہ بھی۔

غرض زندگی کا کوئی پسونا ایسا نہیں ہے جسے تشنہ کہا جائے۔ ساتھی آپ
نے اپنے افسانوں میں ترکیبی عناصر یعنی پلات، کردار ماحول و مکالے، منظر نگاری
اور زبان و بیان کا خاص خیال رکھا ہے۔ اسی وجہ سے آپ کا شمار اردو کے
بردل عزیز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب لوگوں کو بے چین
سے آپ کے نئے افسانے کا انتظار رہتا تھا کہ وہ اپنے افسانے میں افسانوی فضنا
کے ساتھ لطیفوں کی آمیزش سے ایسا رنگ بھردیتے تھے کہ افسانہ دوستوں کی
محفلوں میں موضوع بحث بن جایا کرتا تھا۔ احباب ان لطیفوں اور مزاحیہ جملوں
کو اپنی گفتگو میں استعمال کیا کرتے تھے۔ ان کی مقبولیت کی ایک خاص وجہ یہ بھی

ہے کہ ان کے افسانوں میں لطیف اور جمیل عناصر کی کبھی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ ہر وقت ایک نئی بات نئے انداز سے اس طرح کمی ہے کہ قاری پر ایک گھر ان نقش چھوڑ جاتی ہے بقول حجاب امتیاز علیہ

"ڈاکٹر شفیق الرحمن کی کہانیوں میں تکلف اور پیچیدگیاں مطلق نہیں ہوتیں۔ ان کے برومنی اور تفریجی دونوں قسم کے افسانوں میں ایک بے ساختگی اور روانی ہے۔ افسانہ واقعات سے زیادہ کرداروں کے طرزِ عمل سے نشوونما پاتا ہے۔ وہ کرداروں کے ذہنی تجربے سے زیادہ سروکار نہیں رکھتے۔ ان کے خارجی طرزِ عمل سے لطف و دلپیسی پیدا کرتے ہوئے۔ تیزی سے گزر جاتے ہیں۔ تمام افسانوں کا تعلق درمیانی طبقے کی زندگی سے ہے۔"

چ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اپنے افسانوں میں رومانس کو ایک نئے انداز سے جگہ دی اور رومانس اور مزاح کی ملی جلی کیفیات کو بڑی فن کاری سے پیش کیا۔ یہ اسلوب کا انداز اور حسن کسی دوسرے افسانہ نگار کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔ قاری یہ اس میں ڈوب کر رہ جاتا ہے اور افسانے کے واقعات سب کے سب حقیقی۔ ہر شخص اپنے ہوش و حواس میں ملے گا۔ یہ کرداروں کی خصوصیت ہے، یعنی اپنی محبوبہ کے علاوہ اسے دوسرے لوگوں کا بھی خیال رہتا ہے وہ دنیا نہیں چھوڑ دیتا ہے یعنی ڈاکٹر شفیق الرحمن کے کردار خالص عاشق نہیں ہوتے ہیں بلکہ ایک عام انسان ہوتے ہیں۔ کبھی وہ ایک طالب علم کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ تو کبھی ایک ڈاکٹر کے روپ میں۔ غرض برائی داہم میں ان کے کردار دوسروں کے سکھ دکھ کے ساتھی ہوتے ہیں جو زندگی کی حقیقوں پر سے پرده اٹھاتے ہیں:

کرنیں۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص 7

”میں نے کتابیں ترتیب سے رکھیں اور سوچا کہ فقط آج کا دن اور ضلع کر لیں، تھوڑی سی کرکٹ کھیلیں، تھوڑا ساتیر لیتے ہیں اور پھر ایک بچہ دیکھ لیں گے۔ بس کل سے پڑھانی شروع کر دی جائے گی۔“^۱

”کہ بورہ عاشق نہایت بیوقوف ہوتے ہیں۔ بالکل بچے بن جاتے ہیں جو مانگو لا دیتے ہیں۔ ذرا سی بات پر خوش ہو جاتے ہیں تم دوسری لڑکیوں کو بھی سیی مشورہ دیا کر تیں کر وہ لڑکوں کو چھوڑ کر بورہوں کی طرف متوجہ ہوں۔“^۲

ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

”ناشتر پر میرے سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے بتایا کہ وہ محاذ پر خود جاربا ہے۔ اس نے خود اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ وہ پر سکون زندگی سے تنگ آچکا تھا۔ اسے بل چل کی تلاش تھی۔ ویسے بھی محاذ پر جانے کے کئی فائدے ہوتے ہیں۔ ترقی کی امید ہوتی ہے۔ اعزاز ملنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں اور پھر وہاں خرچ تو بالکل صفر ہوتا ہے۔“^۳

ان مثالوں سے اس بات کی وضاحت کرنا مقصود ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے افسانوں کے مختلف موضوعات میں اور ان سب میں حقیقی زندگی کی سچائیوں کو بہت گرانی سے درد و کرب کے ساتھ مزاحیہ انداز اختیار کرتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ جو آپ کے افسانوں کو زندگی سے بہت قریب کر دیتے ہیں اور کوئی بھی قاری چونکتا نہیں ہے کیوں کہ ہر قاری کو احساس ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے، جو ہوا نہیک ہوا۔ ایسا ہی اکثر ہوتا ہے۔

^۱ امریں۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص 66 (افسانہ۔ زیادتی)

^۲ پچھاواے۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص 41 (افسانہ۔ منزل)

^۳ پچھاواے۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص 47 (افسانہ۔ منزل)

ڈاکٹر شفیق الرحمن کے افسانوں کا بیرو ایک عام انسان ہوتا ہے۔ جس کے سامنے چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور غمتوں کے علاوہ بڑے بڑے مسائل بھی ہوتے ہیں۔ تو ذمہ داریاں بھی۔ جن کو نبھانا اور حل کرنا اس کا فرض ہوتا ہے۔ اور وہ ایک عام انسان کی زندگی بسر کرتا ہے مگر بعض افسانوں میں زندگی کی بڑی تلنے حقیقتوں کی طرف بھی اشارے کیے میں کہ انسان پر سب بیکر طرح کا وقت پڑتا ہے۔ کبھی وہ بنتا ہے تو روتا بھی ہے۔ کبھی کبھی اسے بڑے کھن امتحان سے گزرنا پڑتا ہے تو کبھی قربانیاں دینا پڑتی ہیں اور راتے سے بہت جانا پڑتا ہے۔ عشق و محبت کے معاملات میں اکثر دیکھنے کو ملتا ہے کہ جب ایک شخص کو احساس ہوتا ہے کہ اس کی محبوبہ اس کو پسند نہیں کرتی ہے تو وہ راتے سے بہت جاتا ہے۔ اس طرح کے ایک شخص کے جذبات کی ترجمانی ڈاکٹر شفیق الرحمن نے بہت ہی جذباتی انداز سے کی ہے۔ جوان کے رومانوی افسانوں میں ایک نئی جان ڈال دیتے ہیں اور زندگی کا ایک نیا رخ سامنے آتا ہے۔ جس میں رومان کی ایک نئی لہر کام کرتی ہے:

"اور اس آٹھ سال کے طویل عرصے میں۔ میں کس قدر بدل گیا تھا۔ اس عرصے میں نہ تو ثریا مجھے کبھی یاد آئی۔ نہ کبھی اداں ہوا۔ میں نے کسی کو بھی یاد نہیں کیا۔ نہ مجھے احمد پرشک آیا نہ حسد ہوا۔ میں سب کچھ بھولنے لگا اور کامیاب ہو گیا اور اب جب میں اپنی نئی زندگی سے مطمئن ہوں۔ تو نہ جانے کیوں تھریا مجھے بھولے بسرے خواب یاد دلاری ہے اور یہ خواب کیسے صاف اور صحیح ہیں۔ دراصل یہ خواب نہیں ہیں۔ حقیقتیں ہیں اور میں سب کچھ بھول جانے پر بھی کچھ نہیں بھولا۔..... مجھے سب کچھ یاد ہے۔ اس طویل عرصے میں یہ پرانی یادیں میرے دل کے کسی حصے میں محفوظ رکھی ہیں۔"

ایک چنگاری را کہ میں دبکتی رہی اور اب کوئی اس چنگاری کو
ہوا دے رہا ہے۔^۱

اور جب کسی کا محبوب حالات سے مجبور ہو کر دوسرے سے شادی کر لیتا
ہے تو اس کے دل پر کیا بیتی ہے۔ اس طرح کی کیفیات کو بھی ڈاکٹر شفیق
الرحمٰن نے بہت خوبصورتی اور حقیقت پسندانہ انداز سے پیش کیا ہے کہ دل
بل جاتا ہے:

”اس کے بعد بھیا کی قسمت پلٹ گئی۔ وہ برجگہ بیچپے رہنے لگے۔ ہر
 مقابلے میں بارے لگے۔ جن جن کھلیوں کے وہ اتے اچھے کھلاڑی تھے۔ ان
میں ایسے پھرڈی ہو گئے کہ سب حیران رہ گئے۔ جیسے ان میں قوت
ارادی باقی نہ رہی۔ ہر جدو جہد میں رہ جاتے جو کام شروع کرتے۔ وہ یقین
میں چھوڑنا پڑتا بڑی محنت کے بعد بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔ اب بھیا
تھے اور متواتر ناکامیاں ناکامیاں ناکامیاں۔^۲

ڈاکٹر شفیق الرحمن نے جس ماحول کی عکاسی اپنے افسانوں میں کی ہے۔ وہ
اس وقت کا بہت آزاد ماحول تھا۔ اعلیٰ متوسط طبقہ جو بڑے بڑے زمیں داروں،
جگیرداروں یا اعلیٰ افسران اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں یہ مشتمل تھا۔ سب کے سب
بہت آزاد خیال لوگ تھے۔ یہ لوگ ہربات پر انگریزوں کی پیروی کرنا پسند کرتے
تھے۔ عورتوں کی آزادی کے خواباں تھے۔ پردے کے سخت مخالف تھے۔ اسی
سو سائی کو زیادہ تر ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے لیکن
اس سب کے باوجود ان کے افسانوں میں بعض اشارے اس طرح کے بھی ملتے
ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چند لوگوں کے آزاد خیال ہو جانے کا یہ مطلب
ہرگز نہیں ہے کہ پورا سماج یا معاشرہ آزاد خیال ہو گیا۔ مثلاً پرده سسیم کو بی

^۱ دو جزء ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ (افسانہ۔ دو جزء)

^۲ کرنی۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ (افسانہ۔ کرنی)

لے لیجئے۔ چند گھرانوں نے مخالفت کی اپنے گھر کی عورتوں کا پردہ تڑوا دیا لیکن باقی خاندان کی عورتیں تو اسی طرح پردہ کرتی رہیں۔ ساتھ ہی یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ انسان ایک سماجی جانور ہے جو اکیلا نہیں رہ سکتا ہے اور سماج کے لوگوں کی سخت ضرورت پیش آتی ہے۔ پردہ سسٹم کی وجہ سے مردوں کا عورتوں سے سیدھا تعلق قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے ڈاکٹر شفیق الرحمن کو بہت دقت بیرون بیرون کے ملک میں پیش آئی اور ان دونوں یہ بات عام طور پر چلن میں تھی کہ بہنوں کی سیلیوں سے محبت کی جاتی تھی یا ہو جاتی یا گھر میں آئے بھائی کے دوستوں میں سے کسی ایک پر نظر عنایت ہو جاتی تھی۔ اس کا مذاق بڑی حقیقت پسندی سے ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اڑایا ہے اور اپنے دور کی صحیح ترجمانی کی ہے:

”لڑکیوں کے نام پر مجھے رونا آگیا۔ آخر کون چاہتا ہے کہ ان کی سیلیوں کے سامنے جائے۔ خواہ مخواہ کی مصیبت ہے مجبوراً اسی طریقے ساتھ ہو لیا۔“^۱

ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

”یہ بھیا نہیں تھے کوئی اور تھا۔۔۔ یہ رفیق تھا۔ میں جو اور ہنسی چھوڑ کر بھاگی ہوں۔ تو تن بدن کی ہوش نہ رہی۔ سامنے سے ای آربی تھیں۔ دروازے میں ان سے زور کی ٹکر ہوئی۔ یا۔ دہشت! آخر یہ بچپنا جائے گا کب۔؟ انہوں نے ڈانت کر کہا۔“^۲

ڈاکٹر شفیق الرحمن کے افسانوں کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ان میں کردار بہت کم ہوتے ہیں۔ تین چار سے زیادہ کردار آپ کو شاید ہی کسی

^۱ ٹگلو فی ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ (افسانہ۔ بڑی آپا)

^۲ ٹگلو فی ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ (افسانہ۔ نرسن)

افسانے میں علمی اور ان میں سے بھی اکرثوبی پرانے کردار ہوتے ہیں۔ جن کو ہم پہلے افسانوں میں پڑھ چکے ہوتے ہیں۔ مثلاً "شیطان" کے کردار کو ہی لے لیجئے۔ اس کا نام پڑھتے ہی۔ اس کردار کی ساری خوبیاں اور خامیاں آپ کے ذہن میں آجائی ہیں اور افسانہ نگار کو کردار کا تعارف پیش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بس یہ ضرور ہے کہ اس طرح کے کرداروں سے افسانہ لکھنے میں اور قاری کے سمجھنے میں سولت ضرور محسوس ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ کردار سارے ہی ہمارے جانے پہچانے ہوتے ہیں مگر قاری کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ کونی نیا افسانہ پڑھا ہے بلکہ یہ احساس قائم ہوتا ہے کہ وہ اس جانے پہچانے کردار کی کونی نی ایکسپو فی پڑھنے جا رہا ہے۔ اس انداز کی وجہ سے ڈاکٹر شفیق الرحمن اپنے قارئین میں زیادہ اضفاف نہیں کر پاتے۔ شیطان کے علاوہ رضیہ اور خود ان کا اپنا کردار "میں" افسانے کے ارتقا، میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کردار نگاری کا یہ انوکھا انداز بالکل منفرد ہے۔ جو صرف ڈاکٹر شفیق الرحمن کے ہی افسانوں میں ملتا ہے۔ جس نے انہیں مقبولیت بھی بخشی ہے۔ اور وہ پہچانے جاتے ہیں۔ اپنے کردار "شیطان" کے ذریعہ سے۔ کیوں کہ اس کردار کے ذریعہ ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اپنے طالب علمی کے زمانے کی شرارتوں اور حملے بازی کو پیش کیا ہے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ یہ کرادر ایک فرضی کردار نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بچپن کے دوستوں میں سے تھے مگر اکرث جگہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ بہر حال کردار بہت دلپس پ اور بے حد جاندار ہے۔ جس کو بھلانا آسان نہیں ہے یہ کردار خوجی، امراء و جان ادا جیسے لازوال کرداروں میں سے ایک ہے اور یہ ڈاکٹر شفیق الرحمن کی اردو ادب کو بہت بڑی دین ہے کہ انہوں نے اردو ادب میں شیطان کا کردار دیا ہے۔ جسے رہتی دنیا تک فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔

یگفتگو کے موضوع صرف دو تھے۔ پہلا موضوع شادی تھا اور

دوسرा موضوع بھی شادی تھا۔ شیطان کریم کے ساتھ لگے ہوئے۔ اس کی بائیں آنکھ کو بڑی لیچائی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میں تو ایسے شخص سے شادی کروں گی۔ جو دولت مند ہو۔ صاف گو اور دلیر ہو، صاحبِ عزت و صاحبِ دماغ ہو۔ نمایاں شخصیت کا مالک ہو۔ مشور و معروف ہو۔“

تم نے دیر لگا دی۔..... شیطان بولے۔..... ”مسز چرچل اس شخص کو کبھی کی بتھیا چکی ہیں۔“

منظرِ نگاری اور ماحول کی عکاسی بھی افسانے کا ایک لازمی جزو ہے۔ کیون کہ جس ماحول میں کردار سانس لیتے ہیں۔ اس کی وضاحت اگر نہ کی جائے تو قاری کو یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ افسانہ نگار کس زمانے کی بات کر رہا ہے۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن نے منظرِ نگاری کو بڑی خوبصورتی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے کہ پوری تصویرِ آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ پورا ماحول سامنے آ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ گھریلو زندگی اور بوسٹل کی زندگی اور کمرے میں اکیلے رہنے کا انداز، جیسی ایک ایک چیز کھل کر سامنے آ جاتی ہے اور قاری کو احساس ہو جاتا ہے کہ یہ کمرہ کس کا ہے:

”شیطان کے کمرے میں جا کر دیکھتے ہیں تو ایک بڑے سے پلنگ پر کچھ حضرات رضاۓیاں اوڑھے کھانا کھا رہے تھے۔ رضاۓیاں منگال کتیں اور ہمیں بھی ساتھ بھالیا گیا۔“

ان چھوٹی چھوٹی جزئیات کے ساتھ جب ڈاکٹر شفیق الرحمن قدرتی مناظر کا بیان کرتے ہیں تو پورے ماحول کی تصویرِ آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے اور ایسا

۱۔ مزید حقیقتیں ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص 115 (شیطان۔ عینک اور موسم بہارا۔ حقیقتیں ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص 120 (افسانہ۔ ننانوے نات آؤٹ)

محوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم وہاں خود موجود ہوں اور سب کچھ آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔

"اس رات سخت برف باری ہوئی۔ ساری رات برف کے بڑے بڑے گالے تیزی سے گرتے رہے۔ رات بھر میں ان کے متعلق ہی سوچتا رہا۔ دفعاً خیال آیا کہ انہوں نے اپنے ناشتے کا توکونی انتظام کیا ہی نہیں۔ میں انہا نوکروں کو جگایا۔ جو کچھ مل سکا انہا کیا۔ ناشتہ تیار کر کے ایک تھیلے میں بند کیا۔ صبح پلنچ بجے سے بی میں کھڑلی میں جا کر کھڑا ہوا۔ چاروں طرف انہ حیرا تھا۔ البتہ برف کی چمک سے نہایت مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ بلا کی سردی پڑ رہی تھی۔ ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"پہنچے زرد ہو کر گر پڑے۔ پھول مر جھا گئے۔ نہیاں لنج منج رہ گئیں۔ خزان آگئی۔ وہ ن آیا۔ جکڑے سوکھے پتے اڑنے لگے۔ گرد و غبار نے آسمان پر جھا کر چاندنی اداس کر دی۔ تاروں کو بے نور کر دیا۔ وہ خستی پھیل گئیں۔ وہ ن آیا۔ کونپیں پھوٹیں۔ بھریاں میں پیلی پیلی سرسوں پھولی۔ رنگیں ستیاں اڑنے لگیں۔ غنچے مسکرانے لگے۔ پرندوں کے نغموں سے دیرانے گونج آئے۔ بہادر آگئی لیکن وہ ن آیا۔ دن لبے ہوتے گے۔ لمبی لمبی جھریاں لگیں۔ سفید بلکوں کی قطاریں سیاہ گھناؤں کو چیزرتی ہوئی گزر گئیں۔ نیلے بادل آئے اور برس کر چلے گئے۔ جھیلوں کے کنارے قوس قزح رنگیں ہو گئے۔ لیکن وہ پھر بھی ن

ان دونوں بی اقتباسات میں ڈاکٹر شفیق الرحمن نے افسانوی انداز اور افسانوی طرز کا کس قدر خیال رکھا ہے۔ ساتھی موسوں کے بدلتے رنگوں کا ذکر جس بر جستگی اور روانی سے ڈاکٹر شفیق الرحمن نے کیا ہے اور محبوہ کے انتظار کو جس شدت سے پیش کیا ہے۔ وہ ان کے فنی کیفیات کی غمازی کرتا ہے۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن کو اسی لیے ایک صاحب طرز افسانہ نگار کہا جاتا ہے۔ وہ دوسرے افسانہ نگاروں سے اس لیے بھی منفرد نظر آتے ہیں کہ افسانوں میں بہت چھوٹی چھوٹی جزئیات کے ساتھ، مزاج اور شوخی و شرارت کو اس طرح ملا کر پیش کرتے ہیں کہ افسانے میں ایک نیا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ مزاج کی کیفیات کو بیان کرنے میں ڈاکٹر شفیق الرحمن نے بعض جگہ پرانے لطیفوں سے کام لیا ہے لیکن ان کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں:

"انھیں زبردستی جگایا ارسے میرے منہ سے نکل گیا۔ "تم عینک لگا کر سوتے ہو۔"

"کل عینک لگانی بھول گیا تھا۔ رات بھر خواب دھندے نظر آئے اور میں چاہتا ہوں کہ خواب صاف دکھائیں دیں۔"

یہ چھوٹی چھوٹی سے جملے قاری کو منے پر مجبور کر دیتے ہیں اور قاری کو اپنے ساتھ بھاکر لے جاتے ہیں اور پورا افسانہ پڑھنے کے لیے مجبور کر دیتے ہیں کیوں کہ قاری کو برابر ایسے جملوں اور لطیفوں کی تلاش رہتی ہے یہ انداز قاری پر دہرا اثر چھوڑتا ہے اور وہ نہ صرف پورا افسانہ پڑھتا ہے بلکہ اسے یاد بھی رکھتا ہے اور گفتگو میں وہ ڈاکٹر شفیق الرحمن کے لطیفوں کو دہراتا بھی ہے۔

زندگی کی ایک بہت چھوٹی سی بات مگر جو بہت اہمیت رکھتی ہے ایسی

پچھتو سے ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص۔ 133 (افسانہ۔ جین)

شگونے ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص 213 (افسانہ۔ شیطان)

بہت سی چیزوں کو جس برجستگی، سچائی اور حقیقت کا جامہ ڈاکٹر شفیق الرحمن نے پہنایا ہے۔ کم بھی افسانہ لگاروں کی نظر و باہ تک گئی ہے کہ مثلاً دو محبت کرنے والے بہت سی باتیں اشاروں اشاروں میں کہہ جاتے ہیں لیکن کبھی ایسا ہو کہ دوسرا ان اشاروں کا مطلب نہ کمحجہ تو دوسرے کو الجھن محسوس ہوتی ہے اور اس کے جذبات محدود ہوتے ہیں۔ ایک اقتباس ایسی بھی کیفیت کا ملا خط فرمائیے:

”مگر میں نے تو کبھی ایسا اشارہ نہیں کیا جس سے آپ میرے متعلق کوئی خیال قائم کر سکتے۔“

واقعی آپ نے کوئی اشارہ نہیں کیا۔ مگر یہ میری حماقت تھی جو میں نے ایسا سمجھا اور اب تک سمجھ رہا ہوں۔ میں آپ کو کبھی تکلیف نہ دوں گا۔

یہ آپ کی مرضی ہے۔ میں نے کب آپ سے التجاک تھی۔ اس نے عجیب لگابوں سے میری جانب دیکھا گویا کہہ رہا ہو کہ مجھے تم سے ایسی امید ہرگز نہ تھی۔ اس کے چہرے پر کرب تھا، ایک بے چینی تھی۔ جیسے اسے انتہائی درجے کی تکلیف ہوئی ہو۔“

غرض بہر لحاظ سے ڈاکٹر شفیق الرحمن کے افسانے کمکل افسانے ہیں۔ اس میں کوئی دوارے نہیں ہے لیکن بعض افسانوں میں انجام کچھ مہم سا ہے۔ جس سے قاری بھی کبھی الجھ جاتا ہے۔ اسے پتہ ہی نہیں چلتا ہے کہ آخر ہوا کیا۔ یعنی بعض افسانوں میں ڈاکٹر شفیق الرحمن انجام کو لے جا کر ایسی جگہ چھوڑ دیتے ہیں کہ قاری خود ہی فیصلہ کرے کہ کیا ہوا۔ اسے بھی ان کے افسانوں کی ایک خوبی قرار دی جاسکتی ہے مگر کچھ قارئین کو اس پر اعراض بھی ہے۔

۷۔ ٹلکو فہ ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص۔ ۱۹ (افسانہ۔ ہمتی آپ)

جیسا کہ سب بی جاتے ہیں کہ ایک افسانے میں ابتداء، درمیانی حصہ اور انعام کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اس میں ڈاکٹر شفیق الرحمن درمیانی حصے پر زیادہ زور دیتے ہیں اور باتوں باتوں میں ایک واقعہ کے بعد دوسرا واقعہ بڑی خوبی سے بیان کرتے چلے جاتے ہیں اور قاری ابتداء اور انعام سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ مگر درمیانی حصہ بہت جاندار اور دلچسپ ہوتا ہے اور قاری سب کچھ بھول کر اسی میں کھو چاتا ہے۔

تجسس بھی ڈاکٹر شفیق الرحمن کے افسانوں کی ایک اہم خوبی ہے۔ جسے بہت سلیقے سے ڈاکٹر صاحب نے اپنے افسانوں میں برداشت کیا ہے یہ تجسس قاری سے پورا افسانہ رُڑھاتا ہے مگر یہ اتنا زیادہ بھی نہیں ہے کہ قاری کا بلیڈ پیلشتر بڑھ جائے اور وہ گھبرا کر بہت سے حصے چھوڑ کر پڑھنا شروع کر دے ماگر اسے انعام معلوم ہو جائے۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن کا دھیما اور تھما ہوا انداز آپ کو ایک ایک لائن پڑھنے پر مجبور کرتا ہے اور تجسس بھی برقرار رہتا ہے یہ بھی بات دلپسی سے خالی نہیں ہے کہ قاری کو افسانے کے انعام سے اتنی دلپسی نہیں ہوتی ہے، جتنی کہ ان کے افسانوں کے درمیانی حصے سے۔ کیوں کہ درمیانی حصے میں وہ رومان، جذبات اور مزاحیہ جملوں سے وہ باتیں کہہ جاتے ہیں کہ انعام فکر سے آزاد ہو کر قاری ان میں بھی الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اور اگر کچھ قاری حضرات ان کے افسانوں کو انعام کی فکر میں چھوڑ چھوڑ کر پڑھیں گے تو وہ ڈاکٹر صاحب کے طرز تحریر اور اسلوب کا لطف نہیں انہا سکیں گے۔

”مضمون نگار حضرات سے التماس ہے کہ فی الحال مضمون

بھینجنے کی ضرورت نہیں ہے صرف ترقی پسند

اشتخارات شائع کیے جائیں گے دفترات کے تین

بجے بند کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد کوئی صاحب تشریف نہ

لائیں۔ دکھ پہنچانے والی تنقیدیں اور دل آزار مضمایں اکثر شائع جوا کریں گے۔ ۱۷

یہ عملی شرارتیں قاری کو ایک ایک لائن پڑھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ بقول

وقار اعظم

”شفیق الرحمن“ اردو کے ان افسانے نگاروں میں سے ہیں جنہیں ان کے ملکے بھلکے رومانوں نے پڑھنے والوں کے ایک خاص طبقہ میں ہر دل عزیز بنادیا ہے اور یہ ہر دل عزیزی انہوں نے اپنے زورِ بازو سے حاصل کی ہے۔ ۱۸

ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اپنے افسانوں کے ذریعہ سے فنی روایت کی پابندی کا حق بھی ادا کر دیا ہے وہ اپنے خیالات اور احساسات کو دوسروں تک پہنچانے میں بے حد کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کا ہر افسانہ ایک پختہ طرزِ فکر کی اچھی مثال ہے۔ ان کے پاس بات کرنے کا ایسا دلکش انداز ہے جو قاری کے دل و دماغ پر گمراہ اثر مرتب کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ قارئین کو دنیا کی سیر بھی کرانی ہے۔ جب جب انہیں ملک سے باہر جانے کا موقع ملا ہے۔ انہوں نے وہاں کے واقعات اور حالات کو بڑی خوبصورتی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے اور اردو ادب کو ایک اچھوتے انداز سے مالا مال کیا ہے۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن کے افسانوں پر مغربی زبان یعنی انگریزی کا بہت زیادہ

۱۷ مرقتہ ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ 146 (افسانہ تمن) ۱۹۱۳ء نیا افسانہ۔ وقار عظیم۔ ص

اور گرا اثر ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مشاہدے، فکر اور ذہنی کاؤش، انہماں و توجہ کی وجہ سے اظہار و ابلاغ کے اچھے اور نئے سے نئے وسیلے انہوں نے فراہم کیے ہیں۔ جس نے ان کے اسلوب کو ایک نیارنگ بخشا ہے۔ ان کی نظرِ انتخاب بھی بہت نفیس ہے۔ فکر کی گھرائی اور تخلیل کی رنگینی کی آمیزش ان کے افسانوں کو ایک نیارنگ و روپ عطا کرتی ہے اور جب افسانہ شوختی و نظرافت میں ڈوب کر قاری کے سامنے آتا ہے تو وہ افسانے میں وہ تمام تر خصوصیات پاتا ہے جو ایک افسانے کے لیے ضروری اور لازمی ہے۔ بقول وقار عظیم:

”شفیق الرحمن نے اپنے افسانوں کے لیے ایک نئی فضنا بنائی ہے اور اس نئی فضنا میں ہمیں جا بجا شفیق الرحمن کی رنگینی اور شوختی جھلکتی دکھانی دیتی ہے۔ رومان کی اس بلکل پچھلکی دنیا کی بھی ہمارے ذہن کو ضرورت ہے۔ اس لیے ہم نہ شفیق الرحمن کو بھلا سکتے ہیں اور نہ ان کے افسانوں کو۔“

الغرض ڈاکٹر شفیق الرحمن کا شمار اردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے سارے ہی افسانے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں جو اردو ادب میں ایک قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں جو رہتی دنیا تک اپنے محضوص لب و لجہ اور طرز بیان کی بنا پر یاد رکھے جائیں گے۔ بقول صفحی الدین صدقی:

”آخر میں ایک اور بات مجھے شفیق الرحمن کے تعلق سے کہنی

ہے۔ وہ گذشتہ پندرہ بیس سالوں سے برابر کھتا آ رہا ہوں
 وہ اردو کے بیشتر افسانے نگاروں کی طرح، تھوڑی دیر کے لیے
 چپک کر غائب نہیں ہوا۔ اس کے افسانوں میں ہمیشہ سے ہی
 توازن رہا ہے۔ کرشن چندر کی طرح اس نے اعلیٰ سے اعلیٰ اور
 بد سے بد ترین افسانے کبھی نہیں لکھے۔ یہی وجہ ہے کہ
 آج تک کسی نقاد نے اس کی طرف غصیل کی نظر نہیں ڈالی۔
 میں تو یہاں تک کہوں گا کہ دنیاۓ اردو میں اس سے زیادہ
 خوش قسمت ترین ادیب کوئی نہیں ہے۔ ۱۰

ڈاکٹر شفیق الرحمن

بھیثیت مزاح نگار

اردو ادب کے مزاح کے میدان میں جن افسانہ نگاروں نے اپنی جولانی طبع کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ان تمام مزاح نگاروں نے ن صرف اپنے دور کی نمائندگی کی ہے بلکہ قارئین کے دل بہلانے اور منے بنانے کا بھی کافی سامان فراہم کیا ہے۔ ملکے بھلکے جملوں، طنزیہ اشاروں، کنایوں میں بڑی گھری گھری اور کام کی باتیں کہے گئے ہیں۔ اس طرح کے مزاحیہ افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر شفیق الرحمن ایک مستند مقام کے مالک ہیں۔

مزاح کے ساتھ طنز کا گہرا تعلق ہے لیکن طنز نگاری بڑے جو کھم کا کام ہے۔ اگر یوں کہا جائے تو بہتر ہو گا کہ طنز نگاری تگلی تلوار پر چلنے کا دوسرا نام ہے کیوں کہ ذرا بھکے تو خود ہی اپنے قتل کا سامان کر بیٹھے۔ اس لیے طنز کو برتبے وقت افسانہ نگار بڑی سوچھ بوجھ سے کام لیتے ہیں اور اس کی تلخی کو کم کرنے کے لیے مزاح کی چاشنی ملاتے ہیں لیکن ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اپنے افسانوں میں طنز سے کم کام لیا ہے اور مزاح سے زیادہ۔ اس لیے انہیں خالص مزاح نگار کہا جاسکتا ہے بقولِ جناب غلام احمد فرقہ:

ڈاکٹر شفیق الرحمن کے مہماں کے کئی مجموعہ جو "لسری" "حافتی" "کرنیں" اور "شگوفہ" وغیرہ کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں طنز کم اور مزاح زیادہ ہے۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن بھی کنھیا لال کپور کی طرح "شفیق لی کاک" سے زیادہ متاثر ہیں۔ ان کے انداز میں طبعی ترافت اور شوونی ہے۔ ان کی تحریروں میں انگریزی مزاح کی جھلک ہے، جو اردو ادب میں ایک نئی چیز ہے۔ ۱۷

ڈاکٹر شفیق الرحمن بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں میں مزاحیہ رنگ موجود ہیں لیکن افسانہ کے علاوہ آپ نے انشائی، سفر نامے اور روپریاز بھی لکھے ہیں۔ ان سب میں ان کا مخصوص دھیمادھیما خالص مزاحیہ رنگ صاف جھلکتا ہے۔ کبھی کبھی بلکل طنز کی چاشنی بھی مل جاتی ہے مثلاً "ریویو" میں انہوں نے اخبارات اور رسائل میں تبصرہ کرنے والے حضرات کی قلمی کھولی ہے:

"غرضکہ اس قسم کا ریویو ہم نے کیا تھا۔ ریویو کوئی پچاس صفحات کا تھا اور وہ دیوان بھل چالیس صفحے کا تھا۔ ریویو اس قدر مقبول ہوا کہ کیا عرض کریں۔ اسے موجودہ دور کا بہترین ریویو قرار دیا گیا اور ہمارا نام ہر جگہ مشور ہو گیا۔ اس کے بعد ہم نے جو ریویو کرنے شروع کیے ہیں تو بس ایک ایک دن میں آنہ آنہ کتابوں پر ریویو کر دیے۔ کتاب کو دو تین منٹ پڑھا اور ریویو کر دیا۔ کتاب کو سو نگاہ اور ریویو کر دیا۔ کتاب کو دور سے دیکھا اور ریویو کر دیا۔ ایک کتاب پر تو ہم نے بغیر دیکھے ریویو کر دیا۔ جو حسبِ معمول ہے حد مقبول ہوا۔ ۱۸

اس طرح کے مضمون کے علاوہ آپ نے پیروڈیاں بھی لکھی ہیں اور جگہ جگہ اپنے افسانوں میں اشعار کی پیروڈیاں بنایا کہ اس خوبصورتی اور بر جستگی سے جڑا ہے کہ افسانے کی دلپیٹ میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

کوئی حقیقت ہے کہ آپ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ان دنوں کیا۔ جب ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی لیکن آپ نے کبھی بھی ترقی پسند تحریک کے اصولوں کی پابندی نہیں کی۔ لیکن پھر بھی آپ کا شمار ترقی پسند افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ آپ کا اپنا ایک خاص مزاج ہے اور ایک خاص طبقہ کے ماحول کی عکاسی وہ اپنے افسانوں میں کرتے ہیں۔ جس کا ترقی پسند تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس تحریک نے انھیں افسانے لکھنے کی طرف راغب کیا اور ایک نئی راہ عطا کی لیکن وہ اپنے آپ کو اپنے ماحول سے الگ نہیں کر سکتا۔

اب تک ڈاکٹر شفیق الرحمن کے 9 افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان میں کچھ سفر نامے، انشائیہ اور پیروڈیاں بھی شامل ہیں لیکن بڑی تعداد افسانوں کی ہے اور سب کو ملا جلا کر اس طرح پیش کیا ہے کہ ایک عام قاری کے لیے ان میں فرق کرنا خاصہ مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر شفیق الرحمن کے یہاں مزاج اور رومانس کا پہلو اتنا گمراہ ہے کہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ صتف ہے کیا۔؟ اور عام قاری ان کے مزاج میں گم ہو کر قہقے لگاتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر شفیق الرحمن نے کئی اصناف کو اپنے مزاجیہ انداز سے شیر و شکر کر دیا ہے کہ قاری اصناف کے جھگڑے میں اٹھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا ہے۔ اور سب بی کو افسانے تسلیم کر لیتا ہے حالانکہ ان افسانوی مجموعوں میں جگہ جگہ پیروڈیاں، سفر نامے اور انشائیے شامل ہیں۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن کا یہ شکفتہ انداز ایک صحت مند ادب کا بانی ہے بقول ڈاکٹر قمر میں۔

"جباں تک ان کی خالص ظرافت کا تعلق ہے۔ یہ رائے بڑی حد تک درست معلوم ہوتی ہے۔ ان کے اس نوع کے افسانے نو عمر لڑکیوں اور لڑکوں میں بے حد مقبول رہے لیکن اس سے پٹ کر انہوں نے ایسے مضمایں بھی لکھے ہیں۔ جن میں طز و تضھیک کی چاشنی بھی ہے۔ مثلاً "ریویو" میں انہوں نے اخباروں اور رسالوں میں تبصرہ کرنے والے رویویونگاروں کی قلعی کھولی ہے۔ "ہماری فلمیں" میں انہوں نے کم شیل فارمولہ فلموں کا ظریفانہ تجزیہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر شفیق الرحمن نے چند شاہکار پیروڈیاں بھی لکھی ہیں جیسے "تیزک نادری" اور "قصہ چہار درویش"۔ یہ دونوں سدا ہمار تخلیقات ہیں۔ ان میں تیزک نگاری اور داستان نویسی کے قدیم اسلوب میں عمد حاضر کی سماجی نامہمواریوں اور انسانی قدروں کی ناقدریوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن ایک خالص مزاح نگار ہیں اس کا ایک ثبوت انہوں نے اس طرح بھی فراہم کیا ہے کہ اپنے افسانوں میں بات سے بات پیدا کر کے اور سے سائے لطیفوں کو دو بارہ نئے انداز سے اس خوبصورتی اور بر جستگی سے اپنے افسانوں میں سمویا ہے کہ ایک بالکل نئی فضنا پیدا ہو گئی ہے۔ جو تھکے ہوئے ذہنوں کو راحت بخشتی ہے۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن کے اس انداز سے مزاح کو بہت فروع ملا ہے جو قاری کے لیے بہترین تفریح کا سامان فراہم کرتا ہے اور قاری بار بار پڑھتا ہے اور دوسروں کو بھی سنتا ہے۔ یہی ان کا اصل فن ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ ڈاکٹر شفیق الرحمن کا نام تو ترقی پسند افسانہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہے لیکن انہوں نے ترقی پسند تحریک کے

اصولوں کی اس طرح پابندی نہیں کی اور نہ بھی ادب کو خانوں میں بانت کر پیش کیا لیکن ان افسانے نگاروں کے ساتھ آپ اس لیے مقبول ہوئے کہ آپ کے افسانوں نے تھکلے ہوئے ذہنوں کو سکون و راحت بخشی اور ایسی زندگی سے واقف کرایا جو ہماری اپنی جانی پچانی ہے ڈاکٹر محمد حسن عسکری نے کیا خوب بات کہی ہے:

”سارے نئے ادب میں بس لے دے کے ایک شفیق الرحمن صاحب ہیں جنہوں نے تفریحی ادب کی طرف توجہ کی ہے۔ یہ شکفتگی یہ لا ابالی پن۔ یہ مچلتی ہوئی جگمگاہت بس انہیں کا حصہ ہے۔“

ڈاکٹر شفیق الرحمن کی مزاح نگاری میں شخصی عمل بہت کار فرمانظر آتا ہے کیوں کہ ان کے افسانے زیادہ تر بیانیہ انداز کے ہوتے ہیں اور وہ خود اس کہانی کو بیان کرتے ہیں اور ”میں“ کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اس ”میں“ کے پیچھے کوئی اور نہیں۔ ان کی اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ اس لیے ان کا یہ کردار ”میں“ ایک معنی خیز چیز بن کر سامنے آتا ہے اور تمام لطیفے وہ خود ساتے ہیں اور دوسروں سے ممتاز ہو کر ابھرتے ہیں ڈاکٹر شفیق الرحمن کا ایک مزاحیہ کردار ”شیطان“ ہے۔ جو اتفاق سے ان کے دوست بھی ہیں جب بھی آپ نے کسی شخصیت کو اپنے مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ وہاں شیطان کے کردار سے کام لیا ہے اور بیچارے ”شیطان“ سے وہ وہ حرکتیں کرتی ہیں کہ قاری لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے:

”میں نے بہت مجبور کیا کہ خدا کے لیے کمیں سے عینک لگوالو اور شریفوں کی زندگی بسر کرنے لگو۔ وہ ہر بار میں کہتے کہ تم مجھے برا بھلا کہ لو، ڈانت لو۔ لیکن بس عینک کا ذکر مت کیا کرو۔

میرے دل کو صدمہ پہنچتا ہے۔

آخر بڑی بحث کے بعد وہ مانے اور ایک عینک ساز کو نمبر دے آئے اگلے بختے ہم عینک لیں گے۔ دکان میں مجسے رکھے تھے، جن کے چپروں پر عینکیں لگی ہوئی تھیں شیطان سید ہے ایک بڑے مجسے کی طرف گئے اور مسکرا کر بولے۔ آداب عرض، میری عینک تیار ہو گئی یا نہیں! میں نے جلدی سے ان کا منہ دکان دار کی طرف کیا، جو بالکل دوسری طرف تھا۔ ۱۰

شیطان کا اصلی نام "روفی" ہے، جو ڈاکٹر شفیق الرحمن کے بچپن کے دوست ہیں، ان کی حرکات کو زیر بحث لا کر ڈاکٹر صاحب نے قاری کی دلپی کے لیے سامان فراہم کیا ہے۔ یہ کردار ان کے افسانوں میں شروع سے آخر تک چھایا رہتا ہے۔ اس کردار کے ذریعہ ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اردو مزاح کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا ہے اور یہ کردار اردو ادب کا ایک لافانی کردار بن گیا ہے۔ یہ کرادر "خوجی" کے انداز کا مزاحیہ کردار ہے، جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔

"ماسٹر صاحب کا چہرے "روفی" کی طرف پھر گیا۔ اگر ایک شخص نے ایک انوپندرہ روپیہ، تین آنے، ایک پانی میں خریدا اور سات روپیہ، دس آنے اور ساڑھے گیارہ پانی میں بیچ دیا تو اسے کتنا نقصان ہوا؟"

جانب میں نے آج تک انوائنا مہنگا بتا نہیں دیکھا، میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

اور تم نے.....؟

مزید حقیقیں، ڈاکٹر شفیق الرحمن، ص 125

میں نے کبھی انہوں دیکھا ہی نہیں۔ روشنی بولے۔
غصہ خدا کا۔ تو آج تک تم نے انہوں دیکھا
(چلا کر) میری طرف دیکھو! نیچے کیا دیکھ رہے ہو۔ ۱۷

ڈاکٹر شفیق الرحمن نے شیطان اور بڑی کے علاوہ کسی اور کردار کو اپنے
مزاج کا نشانہ نہیں بنایا ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ خود اپنے آپ پر بنس لیتے ہیں
اور دوسروں کو بناتے ہیں۔ شیطان کے کردار میں بعض باتیں ایسی ہیں۔ جن
سے گمان ہوتا ہے کہ یہ خود ڈاکٹر شفیق الرحمن ہیں۔ کیوں کہ اس کردار میں
کھلنڈرا پن بہت زیادہ ہے اور یہ آپ کے مزاج کا ایک حصہ ہے اور ان کے
بچپن، اور طالب علمی کے دور کی نشاندہی کرتا ہے۔ کچھ ناقدین حضرات نے اسے
نداق کا اعلیٰ نمونہ نہیں مانا ہے مثلاً ڈاکٹر وزیر آغا فرماتے ہیں:

”ان کے مزاج کی عام سطح بھی بلند نہیں ہے اور جمیعی طور پر
اس میں کھلنڈرا پن نظر آتا ہے۔ بعض موقعوں پر انہوں نے
کرداروں مثلاً بڑی اور شیطان سے بھی مزاج کی تخلیق میں مدد
لی ہے لیکن وہ کردار کی نامہمواریوں کو دکھانے کے بجائے
محض ان کی شرارتوں پر اکتفا کر بیٹھے ہیں اسی لیے کردار سے
پیدا ہونے والے مزاج کا بھی اچھا نمونہ پیش نہیں کر سکے۔“ ۱۸

ڈاکٹر شفیق الرحمن کی مقبولیت کا اصل راز یہ ہے کہ آپ نے مرزا
غالب، رشید احمد صدقی اور پترس نجاری کی طرح خالص مزاج کو اپنایا ہے۔ باقی
دوسرے مزاج نگار جواہر دو ادب کے افق پر ابھرے۔ ان کے یہاں طنز کا پہلو
خاصہ نمایاں ہے لیکن ڈاکٹر شفیق الرحمن کے یہاں اتنا کم ہے کہ اسے پہچاننا
خاصہ مشکل ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں اپنے ما虎وں کا خاص خیال

۱۷ مقتطف ڈاکٹر شفیق الرحمن ص ۹ (افسانہ نیلی جھیل)
۱۸ ادب میں طرز و مزاج و زیر آغا ص 233 234

رکھا ہے جس میں وہ رہتے ہیں جس میں انہوں نے پورش پائی ہے اور ساتھ
بی قارئین کے لیے تفریح کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے
جملوں یا لطیفیوں اور پیر و ڈیوں کے ذریعہ مزاج پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے انہیں
خاص مزاج نگار کہا جاتا ہے:

”میں بھی کیا ہوں۔؟ شیطان ایک ادا کے ساتھ کہتے پھر
ان دنوں لڑکوں اور لڑکیوں میں فرق کیسے معلوم ہوتا ہے۔ ایک
سے چست رنگیں لباس۔ ایک وضع کے بنے ہوئے بال۔ ویسی
بی خوبیوں کی لپیٹیں بیہاں تک کہ ناموں سے بھی پتہ
نہیں چلتا ہے کہ رفت، شوکت، حشمت اور طلعت میں سے
لڑکے کون سے ہیں اور لڑکیاں کون سی۔؟“

ڈاکٹر شفیق الرحمن کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کی
خامیوں پر بھی جھنجھلاتے نہیں ہیں بلکہ خوش دلی سے ان پر مسکراتے ہیں اور
بات کو بنسی بنسی میں یوں ٹال جاتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ حالاں کہ ایسی
بات نہیں ہے کہ ڈاکٹر شفیق الرحمن نے کبھی غم کو برداشت نہ کیا ہو یا کبھی
پیشانیوں سے دوچار نہ ہوئے ہوں مگر ان کے افسانوں میں اس بات کا احساس
بہت کم ہے اور وہ مزاحیہ انداز سے ان سنبھیہ مسائل سے آسانی سے گزر جاتے
ہیں جو قاری کو بے چین کر دیتا ہے:

”کمار بولابے بھی پچ پوچھو تو میرا اس محبت و حبخت سے عقیدہ
انٹھ گیا ہے۔ میرے خیال میں ہم کسی خاص لڑکی سے محبت
نہیں کرتے۔ بس لڑکی سے محبت کرتے ہیں۔ خواہ وہ کوئی بھی
ہو۔ زندگی میں جو لڑکی سب سے پہلے ملتی ہے۔ ہم اسی پر مرستے
ہیں۔ اور اسے یقین کرادیتے ہیں کہ ہمیں بچپن سے فقط اسی کا

انتظار رہے۔ حالاں کے اس کی جگہ اگر کوئی اور لڑکی ہوتی۔ تب بھی ہم بالکل وہی باتیں اس سے کہنے بیٹھ جاتے اور لڑکے کا کیا ہے؟ گراموفون میں چانپ بھری ہوئی ہے۔ ذرا چلایا اور بجنا شروع ہو گیا۔ بس ایک اشارے کی دیر ہے۔ وہی رکارڈ بار بار منہ پر آ جاتے ہیں۔ مجھے یہ کوئے لو۔ میں نے "موہنی" سے وہی باتیں کی ہیں، جو "پشا" سے کی تھیں۔ دیے ہی تھنے اسے دیے ہیں۔ وہی ناز برداریاں کی ہیں اور مجھے ذرا سا افسوس بھی نہیں۔ چند روز ہوئے میں نے پشا کو دیکھا تھا۔ مجھے اس کی صورت سے نفرت ہے۔ وہ مجھے اس قدر بڑی معلوم ہوئی کہ میں وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ اب مجھے محبت سے بھی نفرت ہے۔ یہ سب ڈھکوسلہ ہے۔ اس میں عقیدت نام کو بھی نہیں ہے لیکن یہ پوچھنا تو بھول ہی گیا کہ تمہارا کیا ہوا۔ ۲۷

غرض ڈاکٹر شفیق الرحمن نے مذاق اڑانے کے لیے کبھی کسی کی دلکشی رگ پر باتھ نہیں رکھا ہے۔ وہ غنوں کو کم ہی اپنے پاس آنے دیتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا انداز خالص مزاحیہ ہوتا ہے۔ ان کے مزاحیہ کردار میں کبھی مایوسی یا جھمجنہ لابث آپ نہیں پائیں گے۔ زیادہ تر وہ منتے کھاتے۔ کھلیتے۔ گھومتے پھرتے اور تفریح گاہوں کی سیر و سیاست و رومانس کے موقع فراہم کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اپنے افسانوں میں سمجھیدہ حالات میں بھی الفاظ کی الٹ پھیر سے کام لے کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے انہوں نے زندگی کے تلخ حقائق پر فلم نہیں اٹھایا اور عیش و آرام، سیر و تفریح کی چیزوں کا ذکر کیا ہے:

۳۔ مذہب ڈاکٹر شفیق الرحمن، ص ۱۱۳ (افسانہ، محبت)

”جی بال، واقعی سیرھیاں اترتے چڑھتے وقت ضرور خیال رکھنا چاہیے، کیوں کہ پرسوں بی کا ذکر ہے۔ میں جلدی جلدی نہیں سے اتر رہا تھا، میک لخت جو ایک پھسلی نے سیرھا تو دور دور تک سیرھتا ہوا چلا گیا۔“^۱

ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائے:

”سامنے باور جی خانے میں ایک ملی بڑے مزے سے دودھ پی رہی تھی اور شیطان کے خالو کی سب سے چھوٹی لڑکی پاس کھڑی اپنے رنگین ناخن دیکھ رہی تھی۔ بیگم چلا میں۔ اے ملی ذرا بچھے مڑ کر دیکھنا۔ وہ نہیں دودھ پی رہی ہے۔“^۲

اسی طرح ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اپنے افسانوں میں سے سانے لطفیوں کو اس خوبصورتی اور بر جستگی سے برتا ہے کہ ایک نیا حسن پیدا ہو گیا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ قاری کو احساس نہیں ہوتا کہ وہ ان لطفیوں کو پہلے سن چکا ہے۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن کے طرزِ تحریر نے ان لطفیوں میں تازگی اور شکستگی پیدا کر دی ہے اور وہ بالکل نئے دوپ میں سامنے آتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

”اردو نثر کے جدید دور میں الفاظ اور لطائف وغیرہ سے جن ادبیوں نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، ان میں شفیق الرحمن اور شوکت تھانوی کے نام پیش پیش ہیں۔“

شفیق الرحمن تو بالعموم محض لطائف سے مزاح پیدا کرتے ہیں اور ان کے بعض مصنایں تو صرف لطائف سے ہی مرتب ہوتے ہیں۔ عام انشا پردازی میں بھی ذو معنی الفاظ اور رعایت

^۱ شلوغی ڈاکٹر شفیق الرحمن ص 225 (افسانہ شیطان)
^۲ مزید موقتیں ڈاکٹر شفیق الرحمن ص 130 (شیطان، عینک اور سوسم ببارہ)

لفظی سے ان کے مزاح کی تخلیق ہوئی ہے۔ ۱۷

ایک دو لطیفے ملاحظہ فرمائیے:

”ایک بزرگ جن کی داڑھی بست لمبی تھی۔ سائیکل چلاتے ہوئے۔ ایک بڑھیا کے نکر مار دی۔ بڑھیا بست ناراض ہوئی اور بولی۔ شرم تو آتی نہیں۔ اتنی لمبی داڑھی لیے پھرتے ہو اور سائیکل بھی چلانی نہیں آتی۔ نکریں مارتے پھرتے تو بزرگ نے داڑھی پر باٹھ پھیرتے ہوئے کہا۔ مانی! یہ داڑھی ہے بریکیس تھوڑی بھی بیس۔ ۱۸“

”محض روں نے تو ہمیں عاجز کر دیا۔ تنگ آکر ہم نے روشنی بخھا دی۔ لیکن محض روں کی بھنسبھناہٹ بدستور رہی۔ اتنے میں اتفاق سے ایک جگنو بھی اڑتا ہوا کمرے میں آگیا۔ دیکھی تم نے ان بے ایمان محض روں کی شرارت۔ شیطان بولے —

۱۹ اب یہ مشعل لے کر مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن کی مزاح نگاری کے بارے میں صرف اتنا کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ وہ لطائف یا الفاظ کی الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرتے ہیں بلکہ اصل چیزان کی ذبانت ہے، جس کا استعمال وہ موقع و محل کے اعتبار سے کرتے ہیں اور قاری اپنی بنسی کسی بھی قیمت پر روک نہیں پاتا ہے:

”ایک بچے سے زبانی امتحان میں پوچھا گیا۔ کوئی اسم بتاؤ۔؟

بچے نے کہا۔ کتا

۲۰ اردو ادب میں طنز و مزاح دو زیر آغاص 233

۲۱ ۲۲ ۲۳ ۲۴ ۲۵
لہریں۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص۔ 68۔ (افسانہ۔ زیادتی)

پرواز۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص۔ 68۔ (افسانہ۔ ترب پال)

کوئی اور اسم بتاؤ

جواب ملا۔ کوئی اور کتا۔

مُمتحن بہت خوش ہوا اور عرصے تک خوش ہوتا رہا۔^۱

یہ حقیقت ہے کہ صورت واقعہ کی تعمیر کا سلیقہ اور الفاظ کے بر محل استعمال کا فن ڈاکٹر شفیق الرحمن کو خوب آتا ہے۔ اس پر انھیں بڑی قدرت حاصل ہے جب بھی وہ کسی واقعہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اسی مناسبت سے الفاظ چنتے ہیں اور مزاج پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

یہی ڈاکٹر شفیق الرحمن کی بہرمندی کا راز ہے یعنی وہ ان تمام طریقوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ جو قاری کی دلپی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ انہوں نے بر طریقے کو بر تے میں توازن سے کام لیا ہے۔ یعنی نہ زیادہ الفاظ کی الٹ پھیر ہے اور نہ لطفیوں کی بھرمار کے اصل مقصد ہی فوت ہو جائے۔ اور اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ افسانے کی یمت بھی برقرار رہے۔ ان کے ہر افسانے میں مزاحیہ پہلو اور رومانس اس طرح شیر و شکر ہو جاتے ہیں کہ انھیں الگ کرنا ممکن نہیں۔ جو ایک صحیت مندا德ب کی پہچان ہے۔ بقول وزیر آغا:

”وہ واقعہ کا تارو پود کچھ اس فطری انداز میں تیار کرتے ہیں
اور واقعہ کے نتیجے اتے غیر مستقوع ہوتے ہیں کہ ناظر کے لیے
ہنسی ضبط کرنا محال ہو جاتا ہے۔ وہ مزاج کے باقی تمام حرے
بھی واقعہ کے ابھارنے اور پیش کرنے میں صرف کر دیتے
ہیں۔ چنانچہ واقعہ نگاری جی ان کے مزاج کی بنیادی
خصوصیت ہے۔“^۲

ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اپنے افسانوں کو زیادہ دلپس پ بنانے کے

(افسانہ بہارت نامہ طلباء)

پرواز۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص 108

اردو ادب میں طنز و مزاج۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ ص 23

لیے مختلف اساتذہ کے اشعار کی پیر و دیاں بنائے جو کام لیا ہے۔ وہ اپنے آپ میں ایک بالکل نیا اور جداگانہ انداز ہے۔ جس نے آپ کے افسانوں میں ندرت پیدا کر دی ہے۔ پیر و دی بذاتِ خود ایک صفت کا درجہ رکھتی ہے اور ڈاکٹر شفیق الرحمن نے خود کافی طویل پیر و دیاں لکھی ہیں مثلاً "بُزُك نادری عرف سیاحت نامہ جند"۔ "سفر نامہ جہاز باد سندھی کا"۔ "قصہ پروفیسر علی بابا کا"۔ "قصہ چہار درویش"۔ "قصہ حاتم طانی بے تصویر" جو بہت مقبول ہوئی ہیں۔ لیکن ان سے بہت کر جو مختلف اشعار کی پیر و دیاں بنائے آپ نے اپنے افسانوں میں موقع و محل کے لحاظ سے جس برجستگی سے استعمال کی ہیں۔ وہ اپنائوں جواب نہیں رکھتی ہیں اور افسانے میں بے ساختہ پن پیدا کر دیتی ہیں اور قاری اپنی بنسی روک نہیں پاتا ہے اور پھر بار بار پڑھتا ہے، لطف لیتا ہے اور ڈاکٹر شفیق الرحمن کی ذہانت کی داد دیتا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کر ذاتہ کیا ہے
اب تو عینک کی سخت حاجت ہے
کوئی صورت نظر نہیں آتی۔
حسینوں سے فقط صاحب سلامت دور کی اچھی
نہ ان کی دوستی اچھی۔ نہ ان کی دشمنی اچھی۔
عشق کچھ پڑ گیا ہے نہنہدا سا
آج کل امتحان ہے پیارے۔

۱۔ شلوغ فی ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص۔ 177 (افسانہ۔ مشورے)

۲۔ شلوغ فی ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص۔ 177 (افسانہ۔ مشورے)

۳۔ مزید حاقیقیں۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص۔ 183 (سفر نامہ جہاز باد سندھی کا)

۴۔ لمبیں۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص۔ 159 (قصہ۔ چہار درویش)

ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اپنے قارئین کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کرنے کی بر ممکن کوشش کی ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ صاف گوئی اور حقیقت پسندی سے بھی آپ نے مزاج پیدا کرنے کی کوشش کی اور محسوس ہوتا ہے کہ ایسا ہو گیا ہو گا یا ایسا بھی ممکن ہے۔

”ایک دفعہ شیطان نے غلطی سے لڑکی کی امی کی جگہ ایک لڑکی کو یہ پیغام بھیج دیا کہ مجھے اپنی فرزندی میں قبول فرمائی۔ لڑکی بے حد خفا ہوئی۔“^{۱۴۱}

اس طرح کے ہلکے بھلکے جملوں سے ڈاکٹر شفیق الرحمن مزاج کا ایسا جادو جگاتے ہیں کہ قاری لوٹ پوت ہو جاتا ہے اور مکمل بات بھی سامنے آجائی ہے۔ کسی اشارے یا وضاحت کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی ہے۔ ”ویے لڑکی ہے خوب۔“

بال، ہو بسو اپنی والدہ کا فونو گراف۔ کئی سال سے اپنی عمر 18 سال بتاری ہے۔

جاتے ہو، عورت کی عمر کے حجھے حصے ہوتے ہیں۔۔۔ بچن۔ لڑکی، نوعمر خاتون۔ پھر نوعمر خاتون۔ پھر نوعمر خاتون اور پھر نوعمر خاتون۔۔۔۔۔۔^{۱۴۲}

کہا جاتا ہے کہ اچھے اور اعلیٰ مذاق کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ فکر انگریز ہو اور بات میں سے بات اس طرح پیدا کی جائے کہ قاری اس سے لطف اندوز ہو سکے۔ اگر بے ساختہ قہقہہ نہیں لگائے تو کم از کم زیرِ لب مسکراتے بغیر نہ رہ سکے۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن کے افسانوں میں بعض ایسے مقامات بھی آتے ہیں جب

^{۱۴۱} مزید حاققیں، ڈاکٹر شفیق الرحمن، ص 141 (شیطان، عنیک اور موسم بہار) ^{۱۴۲} حاققیں، ڈاکٹر شفیق الرحمن، ص 142 (افسانہ، کلب)

قاری دل کھوں کر بہتا ہے۔ زیرِ لب مسکراتا بھی اور کبھی کبھی نوبت یہاں تک
پہنچ جاتی ہے کہ کتاب باٹھ سے چھوٹ جاتی ہے اور وہ دیر تک ان ہلکے ہلکے
حملوں سے لطف اندوڑ ہوتا رہتا ہے:

”اس کے بعد معاشرہ شروع ہوا۔ شیطان کی عینک آثار لگئی اور
وہ میرا سوارا لے کر کھڑے ہوئے، ورنہ شاید گردی پڑتے
سامنے دیکھیے۔ اور آخری حرف پڑھیے۔ ڈاکٹر صاحب نے
کہا

کون احرف؟ شیطان متعجب ہو کر بولے۔

آخری سطر؟

کون سی سطر؟

اس تختہ کی آخری سطر؟

کون سا تختہ؟

سامنے کی دیوار پر ٹنگا ہوا تختہ۔

کون سی دیوار۔ شیطان نے حیران ہو کر پوچھا اور معاشرہ ختم
ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھ دیا کہ شیطان کی بنیانی اس قدر
کمزور ہے کہ اسے ہرگز بنیانی نہیں کہا جا سکتا۔“

ڈاکٹر شفیق الرحمن نے انسانی نشیات کا بھی مذاق بست سلیقے سے اڑایا
ہے اور اس حسن کاری سے مزاچ پیدا کیا ہے کہ قاری منے کے ساتھ ساتھ انسانی
فطرت کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

”ان کی کنجوںی مثالی تھی۔ مشور تھا کہ وہ اپنی عینک کے شیشوں میں
سے اس لیے نہیں دیکھتے کہ کسی شیشے کھس نہ جائیں۔ جوانی میں وہ
اپنا ہمی مون منانے کیلئے گئے تھے کہ اخراجات کم آئیں۔ ان کا دل

آئس کریم کی طرح سرد تھا۔ خود فراموشی کا یہ عالم تھا کہ گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر یاد کرنے کی کوشش کیا کرتے کہ اس شب کو ہلے کسی ضرور دیکھا ہے۔ ۱۷

ڈاکٹر شفیق الرحمن کی مزاح نگاری میں آمد ہے۔ بر جستگی ہے، بے ساختہ پن ہے اور طنز کی آمیزش نہ ہونے کے برابر ہے۔ دوسرے مزاح نگاروں کے سیماں کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ اپنے آپ پر منتے ہیں اور دوسروں کو منے کا موقع فراہم کرتے ہیں:

اتے میں نمیند کھل گئی۔ وہ بولی اور خان صاحب نے فلک
شگاف قبصہ لگایا۔ ۲۷

غرض اردو ادب میں مزاح نگاری کی تاریخ میں ڈاکٹر شفیق الرحمن ایک بلند مقام کے حامل ہیں۔ ان کا شمار اردو کے بہترین مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ خاص طور پر ان کے مزاحیہ افسانے، اپنی مثال آپ ہیں۔ جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا، جو رہتی دنیا تک اردو ادب کے شااقین کے لیے تفریح کا سامان فراہم کرتے رہیں گے۔

۱	پھر تو۔ ذاکر شفیق الرحمن۔ ص 43	(افسانہ۔ مژن)
۲	کرنیں۔ ذاکر شفیق الرحمن۔ ص 54	(افسانہ۔ فٹ باؤمر)

ڈاکٹر شفیق الرحمن

اردو ادب میں کئی دوسری اصناف کی طرح پیر و ڈی کی صنف بھی مغربی ادب کے اثر سے آئی ہے۔ ناول کی طرح پیر و ڈی کے لفظ کو بھی جوں کا توں اردو والوں نے اختیار کر لیا ہے یہ ایک یونانی لفظ ہے۔ جس کے معنی "جوانی نفر" ہیں پیر و ڈی دراصل مضمکہ خیز تصرف کا نام ہے۔ جس میں اصل تخلیق کے الفاظ اور خیالات کو اس حد تک بدل دیا جاتا ہے کہ اس میں مزاحیہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کی کسی نظم یا مضمون کو اس طرح پیش کیا جائے کہ اصل خیالات تک بدل جائیں اور اصل تصنیف جو کہ سخییدہ خیالات پر مبنی ہے اس میں مزاح پیدا ہو جائے اور الفاظ کی رُکیب دہی رہے۔۔۔۔۔ پیر و ڈی لکھنا کوئی انتقامی جذبہ نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ بہت سے اصلاحی کام لیے گئے ہیں۔ مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کے تیر بھی خوب بر سائے گئے ہیں۔

اس بات سے توبہ بی حضرات بے خوبی واقف ہیں کہ بنسا بنسانا انسان کے خون میں شامل ہے۔ وہ رونے سے زیادہ بنسا پسند کرتا ہے۔ شاید اسی چیز نے

پیر وڈی کو جنم دیلے ہے پیر وڈی کی بنیادی شرط یہ ہے کہ پہلے کوئی نہ کوئی تخلیقی سرمایہ ہو۔ اس کو پھر مزاحیہ شکل میں پیش کیا جائے۔ خواہ وہ نہ رہ ہو یا نظم۔ جب ہم اردو ادب میں پیر وڈی کے خدو خال تلاش کرتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ پیر وڈی اپنی اصل شکل میں تو اردو میں موجود نہیں تھی لیکن دوسرے شعراء کے اشعار کی زمینوں میں شرکہ کر دوسروں کا مذاق ضرور اڑایا جاتا تھا۔ یہاں ایک بار پھر عرض کر دوں کہ پیر وڈی کے لیے ضروری ہے کہ تخلیقی سرمایہ موجود ہو۔ کسی بھی موضوع پر مزاحیہ انداز میں بہر کچھ لکھ دینا پیر وڈی نہیں کہلاتا۔ پیر وڈی ہمیشہ کسی نہ کسی نظم، غزل یا نرمی سرمائے پر لکھی جاتی ہے۔ پیر وڈی کرتے وقت پیر وڈی نگار اصل مصنف یا شاعر کے اسلوب اور انداز فکر کو مزاحیہ شکل میں پیش کرتا ہے کہ اصل تخلیق کے سمجھیدہ خیالات یکسر مزاح میں تبدیل ہو جائیں اور ایک نیا موضوع ابھر کر سامنے آجائے۔ بقولِ انعام حسین:

”پیر وڈی کا مقصد مذاق اڑانا نہیں ہوتا بلکہ مصنف یا نظم کی طرف کو پہ انداز دیگر متوجہ کرنا بھی ہوتا ہے۔ اصل شاعر یا ادیب کی نظم یا نثر کو ایک تازگی، ایک شکستگی عطا کرنا بھی مقصود ہوتا ہے۔ پیر وڈی نگار کو ہمیشہ آسان اور سهل الحصول خیالات سے کام لینا پڑتا ہے تاکہ اس کی بات آسانی سے دلوں میں جگہ پاسکے۔ اس کو یہ بات خاص طور پر بد نظر رکھنا پڑتی ہے کہ پیر وڈی اتنی روای دوال ہو یعنی الفاظ بیان و خیال کے لحاظ سے اتنی جاذب توجہ ہوں کہ اس کے ذہن نہیں ہونے میں سننے والوں کو خاص دقت نہ ہو۔“ دراصل پیر وڈی کا تعلق مزاحیہ ادب سے ہے، جو ہمیں تمیم اور نشاط کی

کیفیات سے ہم آغوش کرتا ہے۔ اس کا طریقہ میں اتر کر ہمیں زندگی کے حقائق کا شعور بخشندا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ پیروڈی مزاج سے زیادہ طنز کے قریب ہے اور یہ دونوں اصناف یعنی طنز و مزاج ایک دوسرے سے اتنے گھلے ملے ہیں کہ ان کو الگ کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے بقول ڈاکٹر قمر رئیس:

”پیروڈی کافی بھی اپنے مزاحیہ غصہ میں انسانی ہمدردی کے اس پہلو سے عاری نہیں اور کیوں کہ طنز کی طرح اس کا مقصد بھی تنقید ہے۔ اس لیے انسانی ہمدردی کا یہ پہلو، اس کے تنقیدی عمل میں پوری آب و تاب لیکن ضبط و توازن کے ساتھ رونما ہوتا ہے۔“

اردو ادب میں صحیح معنوں میں پیروڈی لکھنے کا رواج ”اوڈھ بچن“ کے زمانے سے شروع ہوا۔ ”اوڈھ بچن“ کے علاوہ اور دوسرے رسائل میں بھی کچھ پیروڈیاں ملتی ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر کا معیار پست ہے لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد جو پیروڈی کے نمونے سامنے آئے وہ زیادہ بہتر اور معیاری تھے۔ نظر میں تو پطرس نجاری سے پہلے کوئی پیروڈی کا بہترین نمونہ موجود ہی نہ تھا پطرس نجاری کے بعد دوسرا اہم نام ملار موزی کا سامنے آتا ہے۔ جنھوں نے گلائی اردو میں پیروڈی کے کامیاب نمونے پیش کیے۔ اس کے بعد نرمی اسالیب میں خاص طور پر پیروڈی کے سلسلے میں ڈاکٹر شفیق الرحمن کا نام ابھر کر سامنے آتا ہے۔ جنھوں نے کئی مشہور اور معروف کتابوں کی پیروڈیاں لکھی ہیں۔ ان میں ”بُرْزَك نادری عرف سیاحت نامہ ہند“ بہت اہم ہے اور بہت مقبول بھی ہوئی ہے کیوں کہ اس میں ایک ظالم بادشاہ کے روز نامچے کو بڑے بھی صاف اور دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس فرماتے ہیں:-

”ڈاکٹر شفیق الرحمن یوں تو مزاج نگار ہیں لیکن اس روز نامچے

میں طنز کے بے شمار پہلو، ان کی گھری سماجی بصیرت کی طرف اشارے کرتے ہیں۔ سلاطین سلف اپنی ترکوں میں نے مفتوح ممالک میں پیش آنے والے تجربات اور عام یا ادنیٰ مشاہدات کو جس طرح اہمیت دے کر بیان کرتے تھے اور بہ جگہ اپنی سطوت و اقبال کے گن گاتے تھے، پیرودی نگار نے انھیں امتیازی اوصاف سے فائدہ اٹھایا ہے ساتھی اس نے محمد شاہی عہد اور دور حاضر کے تضادات کو آمیز کر کے طنز و تفحیک کی دل چسپ صورتیں پیش کی ہیں۔

اس پیرودی کے دو اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

(i) شاہ نے ذکر کیا تو وہ بولا۔۔۔۔۔ کلچر وغیرہ کا تو پتہ نہیں۔ آپ نے "ایگری کلچر" سا ہو گا۔ وہ البتہ مشهور ہے ہم مصور ہوئے تو کہنے لگا آپ سنی سانی باتوں کا یقین نہ کھیجے۔ ویسے ہمارے یہاں چند ایک باتیں واقعی شرہ آفاق ہیں۔ ایک تو یہی دواخانہ جس کے اشتہار آپ چپے چپے پر دیکھتے ہیں دوسرے قدیم روایت جس کے لیے بھیں بدل کر شہر میں چلنا ہو گا۔۔۔۔۔ چنانچہ ہم دونوں کے۔ ایک جگہ ایک شخص (جو کہ مدرس تھا) بھیوں کے آگے بین بجا رہا تھا اور بھیں میں متوجہ نہیں تھیں۔ ایک سیاسی جلسے میں بہت سے حضرات اپنے سامنے ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ رکھے عبادت میں مشغول تھے۔ وہیں ایک شخص با غیرت معلوم ہوتا تھا۔ چلو میں پانی لیے ناک ڈبو نے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک جگہ دو حکام شہر ایک پرندے کو گھسپ کر سیدھا کرنے کی کوشش کر

رب تھے، پرندہ الو تھا..... ایک نہایت ضعیف بزرگ
 قبر کے کنارے پاؤں لٹکائے نوجوانوں پر تنقید کر رہے تھے۔ ”
 ہمارے خیال میں اگر محبت کو شادی اور شادی کو محبت سے
 دور رکھا جائے تو دونوں نہایت مفید چیزیں ہیں۔ لیکن نوجوان
 بڑی جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔ دوسروں کے تجربے سے
 مستفیض نہیں ہوتے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ شادی
 مول لے بنتے ہیں۔ ”

ڈاکٹر شفیق الرحمن کی اس پیروزی کے بارے میں فضل جاوید صاحب اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”بِزَكْ نَادِرِي“ تاریخ بِزَكْ نویسی کو بدف طنز بنانے کر بِزَكْ نویس کے بلند بانگ لمحے کا بڑی خوبصورتی سے مذاق اڑایا گیا ہے۔ اس میں نادر شاہ کی زبانی، دلی آکر قتل عام کرنے کی وجوہات کا بیان، بندوستان کی سیاحت کے دوران یہاں کے معاشرتی عویب، سیاسی رموز، تعلیمی نقاصل، ماذون محبت اور شادی کے بارے میں نظریات، مینا بازار کے مضر اثرات، آج کی ماذون لڑکیوں کی ذہنیت اور سوسائٹی میں رشوت بازاری کے جراشیم، غرض اس قسم کے موضوعات پر ایسی چوٹیں لگانی میں کہ پڑھنے والا قلقے لگاتے ہوئے بھی ان نقاصل کو دیکھ لیتا ہے۔ جن کی نشاندہی پیروزی نگار کا مقصد ہے۔ ۳۷

اس کے بعد آپ نے اور کئی پری وڈیاں لکھیں جن میں "قصہ، چہار

مزید حاققیتی، داکٹر شفیق الرحمن، ص 34 (تذکرہ نادری عرف سیاحت تامہنڈا)

^۶ مزید حاقيتی، ذاکر شفیق الرحمن، ص ۳۸ (ذکر نادین عرف سیاست نامه‌ند)

۳۴ شکوفه حیدر آباد پروردگار نمبر. ص. 17

درویش" بہت مقبول ہوئی۔ یہ میر امن کی مشور کتاب "باغ و بہار" کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ بقول ظفر احمد صدقی:

"قصہ چار درویش میں میر امن دبلوی کے باغ و بہار کا کچھ ماحول لے کر عہدِ جدید کے چار نوجوان طالب علموں کو چار دوستوں کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن کا مقصد اس پیر و ذی میں زیادہ تر تفریح ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہیں۔"

باغ و بہار میر امن کی اس قدر دلپسپ کتاب ہے کہ سو سال گزرنے کے باوجود آج تک دلپسپ سے پڑھی جاتی ہے اور کلبیوں اور یونیورسیٹیز کے مختلف کورسیز میں آج تک داخل ہے۔ اس کی پیر و ذی بھی ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اتنی بھی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اسے ہم ڈاکٹر شفیق الرحمن کی شاہکار پیر و ذی قرار دے سکتے ہیں۔ پہلے درویش کی بدحالی کا قصہ ملاحظہ فرمائیے:

"قصہ مختصر دل و جان سے اس تصویر پر عاشق ہو گیا۔ آنکھوں میں بے قراری بیوں پر آہ وزاری اور دل میں بیماری رہنے لگی۔ ایک ماہ کے اندر بھی اندر میرا حال زبیوں ہو گیا۔ میں پہچانا نہ جاتا تھا، یہاں تک کہ بعض اوقات تو میں اپنے آپ کو بھی نہ پہچان سکتا تھا، سبھی سمجھتا کہ کوئی اور ہوں۔ یار دوست کرتا نے لگے، وہی دوست جو دانت کا نہ پرانجھے اور دانت کا نہ شامی کباب کھاتے تھے۔ اب موقع دیکھ کر کنی کاٹ جاتے۔ بہر روز طرح طرح کے بہانوں اس مصوّر کے باں جاتا، ہر منٹے اپنے

پیر و ذی اردو ادب میں ظفر احمد صدقی، علی گزہ میگزین، طنز و مزاح نمبر ص 52

تصویر اتروتا اور حسین پر نگلین۔ ماہ جبیں و ناز نین کی تصویر
دیکھ اپنی آتشِ شوق بمحاتا۔ ۱۷

ڈاکٹر شفیق الرحمن کی ایک اور پیر وڈی "سفر نامہ جہاز باد سندھی کا" بہت
مقبول ہوئی ہے اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"اس کے بعد یہ ہوا کہ تنقید نگاری کی بدولت مجھے پڑیاں
اچھالے میں خاصی مہارت ہو گئی۔ ادھر فلمی پروپوں کی مانگ
برضتی جاری تھی۔ چنانچہ یہ فقیر فلمی نقاد بن گیا اور فلمی ستاروں
کے متعلق تازہ ترین افواہیں بہم پہنچانے لگا۔ کروڑوں پڑھنے
والے میری رنگیں تحریروں کا بڑی بے صبری سے انتظار کیا
کرتے فلمزاں اور اداکار مجھ سے ڈرنے لگے۔ کئی حسیناؤں
سے اس بہانے دوستی ہو گئی ترقی پسند اور رجعت پسند دونوں
مجھ پر شک کرنے لگے۔ ۱۸

اس پیر وڈی کا انعام ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اس انداز سے نکالا ہے کہ
شاید ہی اس سے پہلے اس طرح کے انعام پر کسی دوسرے مصنف نے
غور کیا ہو:

"پس اے پیارے بھو۔ نتیجہ اس کہانی سے یہ نکلا کہ ضروری
نہیں ہے کہ بہر کہانی سے نتیجہ لکھے۔ ۱۹

ڈاکٹر شفیق الرحمن بنیادی طور پر نژاد نگار بیں اور انہوں نے بہترین نسخی
پیر وڈیاں لکھی ہیں لیکن بعض جگہ اپنے افسانوں میں اساتذہ کے اشعار کی پیر وڈیاں بنانے کر۔
اس جستگی سے موقع و محل کی مناسبت سے لکھی ہیں کہ قاری عشق کراہت ہے۔ ان

۱۔ میری، ڈاکٹر شفیق الرحمن، ص 149۔ عصہ پدار درویش۔

۲۔ مزید محقق، ڈاکٹر شفیق الرحمن، ص 204۔ (سفر نامہ جہاز باد سندھی کا)

۳۔ مزید محقق، ڈاکٹر شفیق الرحمن، ص 217۔ (سفر نامہ جہاز باد سندھی کا)

کا تفصیل سے ذکر بچھلے باب میں آچکا ہے پھر بھی مثل کے طور پر دو اشعار نقل کر رہی ہوں۔

بیاہ کا ایک دن معین ہے
نہیں کیوں رات بھر نہیں آتی۔^۱
مغلسی سب بہار کھوتی ہے
آدمی کا وقار کھوتی ہے۔
اس طرح مختلف اشعار کے علاوہ آپ نے پوری نظموں کی
پیر و دیال بھی بیس اور پیر و دی کے فن کو کامل طور پر برداشت اور اردو ادب میں
اصناف کیا ہے۔

بنیادی طور پر ڈاکٹر شفیق الرحمن ایک مزاج نگار بیس لیکن انہوں نے
قارئین کو بنانے کا کوئی موقع باتحہ سے جانے نہیں دیا ہے۔ اس لیے انہوں نے
مختلف اصناف مثلاً افسانہ، پیر و دی، مضمون، سفر نامہ اور رپورٹ آرڈر جیسی اصناف
میں طبع آزمائی کی اور مزاج کے پسلوکوں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ آپ نے مشور و
معروف کتب اور نظموں وغیرہ کے علاوہ ایسے موضوعات پر بھی پیر و دیال بھی
بیس جو پوری ایک صنف کا درجہ رکھتی ہیں مثلاً خطوط نگاری اس
موضوع پر آپ نے بہت ہی لاجواب پیر و دی "زنانہ اردو خط و کتابت" لکھی
ہے۔ جو آپ کو چند ہی دن میں خط و کتابت کے سلسلے میں ماہر بنادے گی۔
در اصل یہ ایسی کتابوں پر گمرا طنز ہے جو بازار میں ملتی ہیں اور دعویٰ کرتی
ہیں گہس کتاب کا مطالعہ آپ کو دس دن میں ماہر فن بنادے گا۔ اسی طرح

۱۔ مزید حاصلیں ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص 199 (سفر نامہ جلد بادمند بھی کا)

۲۔ مزید حاصلیں ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص 201 (سفر نامہ جلد بادمند بھی کا)

کی ایک اور پیر و ذہی "یہ ریڈیو روم تھا" بہت پسند کی گئی تھی۔ اس میں ریڈیو روم میں ہونے والے انٹرویو کے دوران جو حماقتی سرزد ہو جایا کرتی ہیں یا آپ انھیں غلطیاں بھی کہ سکتے ہیں، بڑے ہی دلکش انداز میں پیش کی ہیں۔

الغرض پیر و ذہی سے ہٹ کر موضوع یا مصنف کی پیر و ذہی کرنے کا جو نیا انداز ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اپنایا وہ دوسرے مزاح نگاروں کے یہاں نہیں ملتا ہے۔ یہ ڈاکٹر شفیق الرحمن کی اپنی جدت ہے۔ یہ ان کی اپنی انفرادیت ہے، جس نے انھیں اردو کا واحد پیر و ذہی نگار بنایا ہے۔ "تیزگ نادری" ، "قصہ" ، چہار درویش" ، "قصہ" ، جہاز باد سندھی کا" ، "قصہ حاتم طافی" بے تصویر" ، "ایک دن کا ذکر ہے" ، "قصہ علی بابا کا" اور "زنانہ اردو خط و کتابت" ان کی بے مثال پیر و ذہیاں ہیں جو اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گی اور اپنے مصنف کو زندہ رکھیں گی۔ بقولِ احمد جمال باشا

"شفیق الرحمن کی اردو مزاح میں وہی اہمیت اور حیثیت ہے جو اردو طنز میں رشید احمد صدیقی کی۔ ان کا اصل میدان پیر و ذہی ہے۔"

ڈاکٹر شفیق الرحمن

بھیتیتِ حزن نگار

اردو ادب سے دلپسی رکھنے والے باذوق حضرات ڈاکٹر شفیق الرحمن کی ادبی خدمات سے خوب واقف ہیں اور ان کی مزاحیہ افسانہ نگاری کے دلدادہ بھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ترقی پسند تحریک کے دوران کیا اور جیسا کہ آپ سب حضرات بہ خوبی جاتے ہیں کہ ترقی پسندوں نے ادب کو خانوں میں بانت کر پیش کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادیب بھی خانوں میں بٹ گئے اور ڈاکٹر شفیق الرحمن پر مزاحیہ افسانہ نگار کی مہر لگ گئی۔ لیکن اگر غور کیجیے تو احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک افسانہ نگار ہیں اور انہوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی اپنے افسانوں میں کی ہے گو مزاح کارنگ غالب نظر آتا ہے لیکن اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ صرف مزاحیہ افسانے بی لکھتے ہیں۔ ان پر لکھے جانے والے تمام تنقیدی مصنامیں میں انہیں صرف مزاحیہ افسانہ نگار کی حیثیت سے ابھارا گیا ہے اور ان کے مزاحیہ پہلوؤں کو ہی اجاگر کیا گیا ہے اور ان کے افسانوں کی دوسری خصوصیات کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یہ ہمارے تنقید نگاروں کا مناسب رویہ نہیں ہے۔ میری ناقص رائے میں وہ

ایک ممتاز حزن نگار بھی ہیں کیوں کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں زندگی کے المیہ کو جس خوبصورتی اور سچائی سے پیش کیا ہے وہ خاصے کی چیز بن گئی ہے کیوں کہ زندگی میں جہاں خوشیاں ہیں۔ وہاں غم بھی ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے افسانوں میں دونوں ہی رنگ نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے خوشیوں کا ذکر توجی کھول کر کیا ہے اور جب بھی غموں کی بات کی ہے تو قاری کے آنسو نکل پڑتے ہیں اور اس کے دل و دماغ پر زندگی کے گھرے نقوش ابھر آتے ہیں۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن کے افسانوں کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ انہیں حزن نگاری کا احساس تھا اور وہ اس لفظ کی حقیقت سے خوب واقف تھے۔

"تمہیں حزن کس سے ملا؟ تم تو پارے کی طرح بے قرار تھیں۔ تھلکتی ہوئی۔ تڑپتی ہوئی۔ حسینہ پلے مرتبہ! میں نے تمہیں اس روپ میں دیکھا ہے۔"

ایک اور افسانہ "دورابا" میں انہوں نے حزن کا ذکر بڑی خوبصورتی سے کیا ہے:

"وہ سوچنے لگا۔ شاید اس لڑکی کو حزن سے واسطہ نہیں پڑا یا شاید اسے اپنا حصہ مل چکا ہے۔ یہ جھلکی جھلکی نگاہیں غم آشنا معلوم ہوتی ہیں۔ اس سے پوچھوں۔ لیکن غم اور سرت دونوں جذبے ذاتی ہیں۔ ہر شخص مختلف چیزوں سے خوشی ڈھونڈتا ہے۔ اپنا اپنا ظرف ہے۔ جیسے جنت و جہنم کا تخیل ایک بچے کے لیے بہشت کا تخیل ہو گا اور ایک بوڑھے کے لیے کچھ۔ دہقان کا نظریہ، جہنم فلسفی کے نظریے سے مختلف ہو گا اور پھر

دل کی گھرائیوں تک کون پہنچ سکتا ہے۔ ۱۷

اس افسانے میں وہ عزز کی تلاش میں کمال کمال بھٹکے بیس اور معلوم ہوتا ہے کہ غم، عزز و ملال تو ان کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔
”شبہنم کا خیال تھا کہ جس دور ہے وہ گزر رہا تھا۔ اس سے کبھی کبھی ہر کوئی گزرتا ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو جذبات و تاثرات سے محروم ہیں۔“

لیکن غم کمال نہیں ہے۔؟ غم کی تلاش کتنی آسان ہے۔ اس کونے کے بھی۔ اس نکڑ پران ہیلوں میں۔ یہ سامنے غم ہی کا تو سایہ ہے۔ یہ غم کے قدموں کی تو چاپ ہے۔ جو چکے چکے چکے تعاقب کر رہا ہے۔ یہ غم ہے۔ جو ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ ۱۸

دراصل خوشی اور غم دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ دونوں کو الگ کرنا بھی خاصہ مشکل ہے اور خاص طور پر ایک افسانہ نگار کیے جب کہ وہ حساس دل کا مالک ہو۔ افسانہ ”دعای“ میں ڈاکٹر شفیق الرحمن کی جذباتیت کی انتہا دیکھیے اور جذبات کی شدت کو محسوس کیجیے کہ وہ ایک ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی اپنے مریض کے لیے کس طرح دعا کرتے ہیں:

”میرے آقا! جب بھی میں نے صدقِ دل سے دعا مانگی تو نے قبول کی۔ آج مدت کے بعد دعا مانگ رہا ہوں۔ میں اس لڑکی کی زندگی کی بھیک مانگتا ہوں۔ زابدہ کی زندگی واپس بھیج دے۔ اس پر جو موت کا سایہ چھایا جا رہا ہے۔ اسے بٹا لے۔ اب اس لڑکی کو نہیں مرننا چاہیے۔“ ۱۹

۱۔ چکھتاوے۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص 182 (افسانہ۔ دورہ ب)

۲۔ چکھتاوے۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص 181 (افسانہ۔ دورہ ب)

۳۔ مدوبزر۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص 90 (افسانہ۔ ”دعای“)

ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اپنے افسانوں میں زیادہ تر اعلیٰ متوسط طبقہ کی نمائندگی کی ہے اور غیر بیوں کا ذکر بہت کم کیا ہے۔ حالاں کہ ہمارے سماج میں دونوں بی طبقے ساتھ رہتے ہیں اور دونوں کی زندگیاں ایک دوسرے کے سارے بی گزرتی ہیں۔ ایک غریب لڑکی جب ایک امیرزادے کے دام الفت میں گرفتار ہو جاتی ہے تو لڑکے کے والدین کو یہ بات پسند نہیں آتی ہے کہ ایک غریب لڑکی ان کے گھر کی بسو بنے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس غریب لڑکی کے جذبات کی جس طرح عکاسی کی ہے۔ وہ حزن نگاری کی اچھی مثال ہے:

”وبال میں نے ایک بڑی سیدھی سادھی سی لڑکی بھی دیکھی۔ ایک نازک سی لڑکی جس کی آنکھوں میں ایسا خمار تھا، جیسے ابھی ابھی سو کر انہی ہو یا جیسے خواب دیکھ رہی ہو۔ کچھ ایسی حسین بھی نہ تھی لیکن ایسا معصوم چہرہ میں نے مدتوں سے نہیں دیکھا تھا۔ پنجی نگاہیں۔ سمنی سمنٹی۔ میلے کپڑوں میں لپنی ہوتی۔ بات بات پر ”جی بال۔“ ذرا ذرا دیر کے بعد جاوید کے کمرے میں آجائی تھی۔ رات کو جب جاوید سو گیا تو چیکے سے وہ آئی اور سربانے بیٹھ کر جاوید کا سر ہولے ہولے دبانے لگی۔ مجھ پر نیند کی عنودگی طاری ہو چکی تھی۔ میں چونکا تو چار بجے نہ ہے اور وہ لڑکی چپ چاپ بیٹھی جاوید کا سردبار بھی تھی۔ اس کی پلکیں بھکلی ہوئی تھیں اور وہ نکٹکی باندھے جاوید کو دیکھ رہی تھی۔“

اس طرح کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور جملوں سے ڈاکٹر شفیق الرحمن نے حزن نگاری کی کیفیات کو اس طرح اپنے افسانوں میں جگایا ہے کہ قاری بہت دیر تک ان جملوں اور کیفیات سے آزاد نہیں ہونے پاتا۔

”مجھے بہت بھی افسوس ہے۔ تم سمجھ نہیں سکتے، لیکن تم نے ایک مصیبت میرے لگے ڈال دی ہے۔ اب تم مجھے یاد آیا کرو گے۔ مجھے تم پر ترس آیا ہے۔ شاید تم اندازہ نہیں لگ سکتے۔ میں تمھیں کبھی نہ بھول سکوں گی اور یہ رات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔“

انسان کی زندگی میں خوشی اور غم ایک دوسرے کے بعد اس طرح آتے ہیں کہ انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا ہے۔ یہ قدرت کا کھیل ہے۔ اس سے زندگی میں یکسانیت پیدا نہیں ہو سکتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی انسان کو زیادہ خوشی مل جائے تو خوشی کا لطف ختم ہو جاتا ہے اور زیادہ غم پڑیں تو دیوانہ پن کی کیفیت انسان پر طاری ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی حزن نگاری سے ڈاکٹر شفیق الرحمن کے افسانے پاک ہیں۔ وہ بنسی بنسی میں ایک نہ ایک وقت غم کا سایہ آہی جاتا ہے افسانہ ”بری آپا“ میں جب رفیق کی محبت کو محکرا دیا جاتا ہے تو وہ نہایت غم انگیز انداز میں اپنے سر کو جنبش دے کر اپنے بیوں پر بھیانک مسکراہٹ بکھیر کر انتہائی تکلیف دہ انداز میں کھاتا ہے:

”بہت اچھا..... آپ نے وقت سے پہلے مجھے میری قسم بتا دی۔ کاش مجھے پہلے بھی معلوم ہو جاتا کہ آپ کی نگاہوں میں میری کتنی وقعت ہے۔ اب جبکہ سب کچھ ظاہر ہو گیا ہے۔ ایک اور بات ہے وہ یہ کہ آج مجھے کوئی پہلی بار نہیں محکرا یا گیا۔ میری بے کار زندگی میں مجھے محکرانے والی آپ کوئی پہلی بستی نہیں ہیں۔ اخدا حافظ۔“

جدبائی نگاری کا یہ انداز اپنے اندر اس قدر لاچاری رکھتا ہے کہ پتھر سے پتھر دل بھی پکھل جاتا ہے۔ اس طرح کے جدبائی حزنی پر اگر اف لکھتے ہوے

ڈاکٹر شفیق الرحمن کا قلم آفاق کی بلندیوں کو چھو لیتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ سرف مزاج نگاری نہیں بلکہ بہترین حزن نگار بھی ہیں۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن نے حزن نگاری کو پیش کرنے کے لیے صرف انسانی جذبات سے بھی کام نہیں لیا ہے بلکہ الیہ مناظر کو اس طرح پیش کیا ہے کہ پورا باحول ابھر کر سامنے آ جاتا ہے اور لگتا ہے جیسے پوری کائنات اداس ہو۔

غمگین ہو:

”اوپنچے اوپنچے ڈراؤنے درختوں سے گھری ہوئی جھیلوں کی سطح
میں نے اداسی دیکھی۔ درختوں کے کانپتے ہوئے سائے
دیکھئے، پتوں کی سرسرا بست میں سرد آبیں سنیں۔ میں نے سوچا
کہ پانی کی یہ سطح میری روح کی طرح ہے۔ جس پر تاریکیاں
معکس ہیں..... جس پر دہشتناک تاریکی قبضہ جماری ہے۔
میں نے تحریر تحرارتی ہوئی ٹھیکیاں دیکھیں۔ بڑے بڑے اداس
پھول دیکھئے جو ڈنخلوں پر جھکلے ہوئے تھے۔“

ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

”آسمان سے برف کے بڑے بڑے گالے گر رہے تھے، خون
منجھد کر دینے والی سرد ہوا میں چل رہی تھیں۔ چاروں طرف
برف بی برف تھی۔ اس اجلے ماںوں میں ان کا سیاہ لبادہ دور
تک نظر آ رہا تھا۔“

اس اقتباس میں زندگی کی مصروفیت کو پیش کیا گیا ہے:
”میں خالی نگاہوں سے مادلوں کو دیکھ رہا تھا، آخر ہماری زندگی کا
دار و مدار حادثوں پر کیوں ہے؟ محض حادثے۔ کوئی بھی چیز

باقاعدہ نہیں ہوتی۔ ایسے نہیں ہوتی جیسے اس کو پہلے سے ترتیب دی گئی ہو۔ ایوں ہی اتفاق سے تم ایک دوسرے کے نزدیک ہو جاتے ہیں اور پھر ایک عادثہ نہیں دور پھینک دیتا ہے لیکن بادلوں کی طرح ہی انہاں کے مہتابے دو رہب ستور جاری رہتی ہے۔ زندگی کی دوستی.....

ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اپنے افسانوں کے جیرو اور جیروں کے غمکھیں جذبات کی عکاسی اس قدر غناک انداز میں کی ہے کہ قاری بھی ان کے ساتھ ساتھ رنجیدہ ہو جاتا ہے اور اس کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ اس فن میں ڈاکٹر صاحب کو کمال حاصل ہے:

”سچ تک میں نے فیصلہ کر لیا۔ یہی کہ میرا چلا جانا ہی بہتر ہے۔ میرا کیا ہے؟ پہلے ہی بالکل بے پروا اور خبطی سا ہوں۔ جس کی زندگی کا نہ تو کوئی اصول ہے اور نہ کوئی مقصد۔ میری کیا خوشی اور کیا غم۔ صغرا میرے لیے تھی ہی نہیں۔ اس کی قسم تو اظہر کے باتحوں کبھی کی سونپ دی گئی ہے۔ اس کی محبت۔ ہے۔ مگر محبت تو ابھی پنپڑی بھی۔ ننھا سا پودا ہی تھا۔ ذرا سی بے اختیاطی اسے جڑ سے اکھاڑنے کا کوئی تھی۔ کسی چیز کا بنانا بڑا مشکل ہے اور بگارنا.....؟ بگارنا نہایت ہی آسان۔ محبت کے پیدا ہونے میں دیر لگتی تھی۔ مُنفرت کے پیدا ہونے میں کوئی دیر نہیں لگتی۔ پہلی چیز جتنی مشکل ہے دوسری اتنی ہی آسان۔.....“

ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

”اس نے بچپے مرکر نہیں دیکھا۔ وہ کچھ دیر دونوں ساویں کو دیکھتا

ربا اور یکخت تملہ ائھا۔ اس نے دونوں باتھوں سے اپنا چہرہ
ڈھانپ لیا اور چہرہ کو دمیں پچھا پایا۔

چھر ایک باتھ کی انگلیاں پھیلا کر میری طرف جھانکتے ہوئے
بولبے میں اب تک نہیں جانتا تھا کہ میں زمین پر محض بو جھے
ہوں۔ یقین مانیے۔ مجھے اب تک علم نہیں تھا۔^۱

محبت میں بدگمانی کا ہو جانا ایک فطری سامنہ ہے اس طرح کے جذبات
کی عکاسی بھی ڈاکٹر شفیق الرحمن کے افسانوں میں اپنے عروج پر ملتی ہے۔ ”دو
ستارے“ اور ”نسرين“ اس انداز کے بہترین افسانے ہیں:

”ہم اکٹھے چھرتے۔ تصویریں آتارتے۔ میرا زیادہ وقت ان کے
یہاں گزرنے لگا۔ پڑوں جیسے غائب ہی ہو گئی۔ کیا ہوا۔؟“ کبھی
تیسرے چوتھے روز آمنا سامنا ہو گیا۔ روکھا پھر کا سلام ہوا اور
بس، اب میں پھر بنس کر ہو گیا تھا۔ چڑچڑپن جاتا رہتا تھا۔^۲

اس طرح کی غلط فہمیاں دو محبت کرنے والوں میں اکثر و بیشتر پیدا ہو جاتی
ہیں اور ان کو بڑی خوبصورتی اور بر جستگی سے ڈاکٹر صاحب نے نبھایا ہے۔ ایسی
سورت میں کبھی کبھی تیسرے شخص کو راستے سے بہت جانا پتا ہے۔ ایسے مناظر
کی عکاسی میں ڈاکٹر صاحب بہت کامیاب ہوئے ہیں:

”وہ دونوں محبتیں ایک دوسرے سے پیوست تھیں۔ انہیں
علیحدہ علیحدہ پر کھا بہت مشکل تھا۔ ایک نے دوسرے کو
بھڑکایا۔ بد ظن کیا۔ ایک نے دوسری سے غیر مطمئن کیا اور
دونوں نے ایک دوسرے کو مٹا دیا۔^۳“

۱۔ ”رسیں ڈاکٹر شفیق الرحمن“ ص 177 (دست)۔

۲۔ ”شکوفہ ڈاکٹر شفیق الرحمن“ ص 42 (دست)۔

۳۔ ”چھڑوے ڈاکٹر شفیق الرحمن“ ص 208 (افسانہ دوڑا)۔

اس طرح حزن نگاری کی بہترین مثالیں ڈاکٹر شفیق الرحمن کے افسانوں میں جگہ جگہ مختلف انداز میں ملتی ہیں جو ہمیں زندگی کو حقیقی روپ میں دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہیں اور اس بات کی وضاحت بھی کرتی ہیں کہ ڈاکٹر شفیق الرحمن اپنے افسانوں میں صرف مزاج بی سے کام نہیں لیتے ہیں بلکہ انہوں نے زندگی کے حزن کو بھی قریب سے دیکھا اور پیش کیا ہے۔ حزن نگاری کے اعتبار سے ان کے بہترین افسانے "فاتح باولر"، "منزل"، "کرنیں"، "ثروت"، "وسعت"، "نصرین"، "دوستارے"، "دورابا"، "شکست"، "دو جزر"، "دعا"، "وہ رات" اور "برٹی آپا" بہت اہم ہیں۔ بقول پروفیسر

آفاق احمد:

"شفیق الرحمن کے یہاں ویہ گئے چنے مسائل نہیں ملتے بلکہ ساری کائنات اور اس کی حقیقتیں اس کا موضوع تحریر ہیں، جن میں خوشی اور غم دونوں کو، جو کہ انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں، اجاگر کرتا ہے اور ایک نئی عمدگی کے ساتھ....."

غرض ڈاکٹر شفیق الرحمن کو بحیثیت مزاج نگار تو سب ہی جانتے ہیں اور اس پر کافی کچھ لکھا ہے، چنانچہ اسی کے ساتھ ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ وہ ایک کامیاب حزن نگار بھی ہیں، جو انہوں کو اصل روپ میں پیش کرنے کے فن سے خوب واقف ہیں۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن، بحیثیت حزن نگار، پروفیسر آفاق احمد، ص 13

اگورنمنٹ چائی یہ کلینیکس میگزین، بھوپال

ڈاکٹر شفیق الرحمن

بھیثیت مترجم

ڈاکٹر شفیق الرحمن کو سب بھی ایک مزاحیہ افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ پہچاتے ہیں لیکن بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ وہ ایک بہترین مترجم بھی ہیں۔ انہوں نے طالب علمی کے زمانے میں سب سے پہلے "الحمد" کی کہانیوں کا ترجمہ کیا تھا، جو رسالہ "عصمت" لاہور میں شائع ہوئی تھیں۔ بقول

محمد خالد:

"میرے والد صاحب کی کتابوں میں "وانگٹن ارونگ" کی انگریزی کتاب "الحمد" کی داستانی" کی ایک جلد نکل آئی۔ اسے میں نے شفیق کو دے دیا۔۔۔۔۔ اس نے اس میں سے دو تین کہانیوں کے آزاد ترجمے کیے میرا خیال ہے کہ وہ رسالہ "عصمت" میں چھپے۔ وہ بڑے خوبصورت ترجمے تھے، شوخ اور شگفتہ اور بے تکلف۔ ان کے بعد شفیق مختلف رسائل میں جھینے لگے۔"

اس طرح ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک مترجم کے طور پر کیا لیکن یہ میری بد قسمتی ہے کہ میں ڈاکٹر صاحب کی ان ابتدائی کہانیوں کو تلاش نہیں کر پائی۔ البتہ ان کی ترجمہ کی ہوئی کتاب "انسانی تماشا" کے عنوان سے ضرور دستیاب ہو سکی جو ان کے فن ترجمہ نگاری کی بہترین مثال قرار دی جاسکتی ہے۔ یہ ایک انگریزی ناول ہے۔ ناول کا نام ہے The Human comedy - Wilian Saroyan اور مصنف بھی ہے۔ اس ناول کا کمال یہ ہے کہ مصنف نے انسانی جذبات کی نازک خیالی کو جس خوبصورتی اور صداقت سے پیش کیا ہے۔ اس کی مثال کم بھی ناولوں میں دیکھنے کو ملی ہے۔ کیوں کہ اس میں واقعات سے زیادہ جذبات نگاری پر زور ہے ڈاکٹر شفیق الرحمن کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے طرز بیان سے جذبات نگاری اور جذباتیت کو برقرار رکھا ہے اور الفاظ اس قدر مناسبت سے استعمال کیے ہیں کہ ناول کے اصل حین میں کوئی فرق نہیں آیا ہے اور یہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا ہے۔ اس پر حقیقی تخلیق کا گمان ہوتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی اور اہم وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر شفیق الرحمن کو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ وہ طالب علمی کے زمانے سے ہی ترجمہ کرتے رہے ہیں۔

1956 میں جب ناول "انسانی تماشا" منظر عام پر آیا تو قارئینِ اردو کو یہ احساس ہوا کہ ڈاکٹر شفیق الرحمن نہ صرف ایک بہترین مزاحیہ افسانہ نگار، پروردہ نگار ہیں بلکہ ایک مترجم بھی ہیں۔ آپ کے اس ناول کا شمار اردو کی بہترین ترجم شدہ کتابوں میں ہوتا ہے جو اردو زبان و ادب کے لیے ایک بیش بہا اور فیضی اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس ناول "انسانی تماشا" کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترجمہ نگاری

سے ڈاکٹر صاحب کو ایک فطری لگاؤ سا ہے اور وہ ترجیے کی اہمیت اور ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے ہیں اور اردو ادب کے سرمائے کو مالا مال کرنے کے لیے مغربی ادب کی بہترین کتابوں کو اردو میں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ افسوس سے لکھ رہی ہوں کہ بندوستان میں ان کی صرف ایک بی کتاب ترجمہ کی ہوئی دستیاب ہو سکی۔ باقی اور کوئی مضمون میں پاکستان سے نہیں حاصل کر سکی مگر اس ایک کتاب کے مطالعے نے یہ بات صاف کر دی کہ انھیں ترجمہ نگاری کافن آتا ہے اور اس میں مہارت حاصل ہے کیوں کہ وہ ترجمہ کرتے وقت نفسِ مضمون کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور یہی ایک اچھے اور کامیاب مترجم کی خوبی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اس ناول کو ایسا جامہ پہنایا ہے کہ وہ بالکل بھی غیر مانوس نہیں معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ ترجمہ میں آپ نے مصنف کی زبان و بیان و جذبات نگاری جزیيات اور نزاکتوں کو جوں کا توں منتقل کر دیا ہے۔ جو اصل مصنف نے اپنے ناول میں پیش کیا تھا۔ گو یہ کام خاصہ مشکل تھا لیکن دونوں زبانوں پر مہارت کی بنا پر ڈاکٹر شفیق الرحمن کو اس میں خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ کاش کہ انھیں وقت ملتا اور وہ کچھ اور اچھی کتابوں کا ترجمہ اردو میں کر سکتے مگر اردو ادب میں ایک مترجم کی پہچان بنانے کے لیے ان کا یہ ایک ناول "انسانی تماشہ" بی کافی ہے۔ جو یقیناً اردو ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن

اور

کرکٹ

ڈاکٹر شفیق الرحمن کھیل کو دے رہا ہے۔ وہ خود ایک اچھے مختاری رہے ہیں۔ کھیلوں سے ان کی دلپسی نے بہت سی کھانیوں کو ایک نیا آب و رنگ عطا کیا ہے۔ بعض کرداروں کی شکل میں خود انہوں نے اپنی داستانِ حیاتِ رقم کی ہے۔ ان کے کردار جب کھیل کے میدان میں اترتے ہیں یا کرکٹ کے کھیل کی بات چلتی ہے تو پھر ڈاکٹر شفیق الرحمن کا قلم جس روائی سے دوڑتا ہے، اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے بقولِ مرتضیٰ غائب:

”ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا۔“

ڈاکٹر شفیق الرحمن کا پسندیدہ کھیل کرکٹ ہے۔ اور انہوں نے اس کھیل کو موضوع بنایا کہ بہت سے افسانے لکھے ہیں۔ جو اردو ادب میں اپنی نوعیت کے نہ صرف انوکھے بلکہ دلپس افسانے قرار دیے جاسکتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ ڈاکٹر شفیق الرحمن کو کھیلوں سے خاصی دلپسی تھی۔ کرکٹ کے علاوہ تیراکی اور بائسینگ میں آپ کو مہارت حاصل تھی۔ بائسینگ میں آپ نے کلر بھی حاصل کیا تھا۔ لیکن صرف ایک افسانہ ”سازھے چھے“ ایسا افسانہ ہے،

جس میں بائنسگ کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک یاد و افسانے آپ کو اور ایسے مل جائیں گے۔ جس میں کریم تیراکی یا باکی کے کھیلوں کا ذکر ہے اور جس سے اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کھیلوں سے ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی ہے۔ بس افسانے کے پلاٹ کے لحاظ سے ذکر آگیا ہے مگر اس کے برعکس ڈاکٹر صاحب نے کرکٹ کا ذکر جس خلوص لگن اور محبت سے کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ واقعی کرکٹ کے شیدائی ہیں اور انہیں اس کھیل پر پورا عبور حاصل ہے۔ آپ کے بیشتر افسانوں کے عنوان کرکٹ سے متعلق ہیں مثلاً "فاست باولر" .. "ننانو سے نات آؤٹ" .. وغیرہ وغیرہ لیکن اس طرح کے افسانوں کے علاوہ بھی کرکٹ کا ذکر بیشتر افسانوں میں ملتا ہے اور برعکس سے مکمل ہوتا ہے۔ کیوں کہ آپ نے کرکٹ کی تمام اصلاحات کا بر جستہ اور برعکس استعمال کیا ہے اور اس کھیل کی خوبیوں کے علاوہ خامیوں پر بھی نظر رکھی ہے اور بھرپور طنز بھی کیے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر کس قدر گھری ہے۔ "د جلد" سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"مجھے کرکٹ بالکل پسند نہیں۔ ایک مرتبہ بلا غلط گھما دو تو آؤٹ۔ اگر کوئی اچھے بھلے اسڑوک پر نہایت عمدہ کچ کر لے تو آؤٹ۔ اپنا ساتھی بیٹھ میں ذرا سست دکھائے تو خواہ مخواہ آؤٹ۔ باکی فٹ بال وغیرہ میں غلطیاں کرنے کے باوجود کم از کم ایک گھنٹہ کھیلنے تو دیتے ہیں اور پہلی بی کوتاہی پر میدان سے باہر نکلنا نہیں پڑتا۔"

کرکٹ کے کھیل کے جو اہم موڑ ہیں اور جہاں کرکٹ ضرورت سے زیادہ دلچسپ ہو جاتا ہے اور کھلاڑیوں کے ہی نہیں بلکہ دیکھنے والوں کی بھی دل کی دھڑکنیں بڑھ جاتی ہیں۔ ان کا بیان ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اس قدر دل کش انداز

سے کیا کہ پڑھنے والوں کے دل کی دھرکنسی بڑھادی میں:

ایک گیند پر شیطان نے کٹے کا باتھ دکھایا اور گیند لیگ کی طرف
نکل گئی۔ ہم نے دوز کر دو رنز بنالیے اسکور دو سونانوے
ہو گیا۔ ہم نے اسکور برابر کر دیا تھا۔ اب ہمیں جیتنے کے لیے بھی
ایک رن کی ضرورت تھی اور میری سچری کرنے کے لیے بھی
ایک رن کی ضرورت تھی۔ اور کی تین گیندیں ابھی باقی
تھیں۔ ہر گیند پر شیطان نے بے تحاشا بلا گھما یا۔ لیکن کچھ نہ
ہوا۔ ادھر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ یہ میں عمر بھر سچری
نہیں کر سکتا۔ صدیاں گزر جائیں سچری نہیں ہو گی اور یہ
نانوے ناٹ آؤٹ ایک تمثیل ہے۔ جو مجھ پر لگی ہوئی ہے۔
یہ ایک طوق ہے۔ جو میرے لگے میں لٹک رہا ہے۔ یہ ایک
سینگ ہے۔ جو میرے سر میں اگا ہوا ہے۔ اور میں اس کم
بخت نانوے ناٹ آؤٹ سے کبھی بھی بچھا نہیں چھڑا سکوں
گا۔

اب میری باری آئی۔ وہی نیا بول گیند پھیک رہا تھا
پہلی گیند روکی دوسری روکی۔ تیسری
جو تھی اب آخری گیند تھی۔ ادھر گیند آئی۔ ادھر میں نے
آنکھیں بند کر کے بلا گھما یا خدا جانے گینبلے سے
لگی۔ پہیوں سے لگی۔ جو توں سے لگی لگی بھی یا نہیں
بس گیند نکل گئی دو کھلاڑی بچھے بھاگے۔ ادھر
میں بھاگا۔ دوسری طرف پہنچا تو شیطان وہیں کھڑے تھے۔ میں
نے بچھے مر کر دیکھا کھلاڑی گیند کے بچھے بھاگ رہتے تھے۔ میں
نے شیطان کو دوسری طرف جانے کو کہا۔ وہ وہیں کھڑے رہے۔

میں نے ان کو بازو سے پکڑ کر بلایا لیکن وہ نہیں ہٹھے
 آخر میں ان کو زبردست گھسیتا ہوا۔ اپنی وکٹ تک لا یا اور وباں
 پینچ کر تا بڑ توز و اپس بھاگا بس رن آؤٹ ہوتے
 ہوتے بچا۔^۱

ڈاکٹر شفیق الرحمن طالب علمی کے زمانے میں جب کرکت کھیلتے تھے تو
 فاست باولر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ ایک افسانہ "فاست باولر" میں
 آپ نے طالب علمی کے زمانے کے واقعہ کو خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا
 ہے۔ افسانے کی بیرونی نسیم نے جنم کر فاست باولر کا مذاق اڑایا ہے۔ جب وہ
 ایک میچ کھیل رہے تھے تو نسیم اور ان کے والد خان صاحب میچ دیکھنے
 تشریف لے آئے۔ ان کی موجودگی میں ڈاکٹر صاحب نے اپنا حال ان الفاظ
 میں بیان کیا ہے:

"میچ شروع ہوا۔ میرے قدم ڈگمگارہے تھے۔ میں نے آیت
 الکرسی" پڑھی۔ پھر ایک گلاس پانی پیا۔ دل کو تسلی دی اور
 وکُوں سے قدم گن کر فاصلہ بنایا بولنگ شروع کی
 وکُوں کے پاس آ کر قدم غلط ہو گئے اور ایک عجیب و
 غریب اسئل سے میں نے گینید پھٹکی۔ جو کھلاڑی کے تین
 فٹ ادھر نکل گئی وائڈ بال اسپاٹر چلا یا اور
 لوگوں نے قیقسے لگانے شروع کر دیے۔ بہت اچھے
 شاباش ایسے ہی گینید پھٹکیو^۲

افسانہ "بے بنی" میں جس معصومیت سے ڈاکٹر شفیق الرحمن نے ایک
 مشور کھلاڑی کو کرکت کھیلنا سکھایا ہے۔ اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ اس کو ان

^۱ مرقتیں، ڈاکٹر شفیق الرحمن، ص ۱۱۷-۱۱۸

^۲ کرنسی، ڈاکٹر شفیق الرحمن، ص ۵۹

کے بچپن کی حسین غلطی سے تعمیر کیا جا سکتا ہے:
 "ایک روز کرکٹ کا مچ تھا بلیزر کی جیب میں ان کی ایک تصویر تھی۔ میں نے کھلاڑیوں کو دکھانی۔ ان میں سے چند تو چونک پڑے۔

یہ تمہارے دوست کیے بنے؟
 میں نے بتایا کہ میں انھیں بولنگ سکھایا کرتا تھا، بڑی محنت کے بعد وہ اس قابل ہوئے تھے کہ سیدھی گیند پھینک سکیں۔

بولنگ سکھایا کرتے تھے۔ ان کو

بال!

جاتے ہو یہ کون ہیں آسٹریلیا کے مشور بولر جو اپنے وقت کے بہترین بولر رہ چکے ہیں لیکن مجھے یقین نہیں آیا انہوں نے ایک کتاب میں "فرینکلی" کی تصویر دکھانی۔ لیکن چچ میں نے انھیں بالنگ سکھائی تھی۔

میرا خوب مذاق اڑا۔ ۷۰

کرکٹ انگریزوں کا کھیل ہے۔ انگریز اس کھیل کو دل و جان سے پسند کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن نے "ڈینیوپ" میں بڑی خوبصورتی سے انگریزوں کے مزاج اور کرکٹ کے کھیل کا مقابلہ کیا ہے۔ اور یہ بات ثابت کر دی ہے کہ قوم کا مزاج کھلیوں میں آتا ہے اور کھلیوں کے اصول سے زندگیاں بنتی ہیں۔ سنورتی ہیں۔ وہ تہذیب، ڈسپلن جو کھیل کے میدان میں کھلاڑیوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ وہ انگریز قوم کا مزاج ہے:

۷۲-۷۳ ص۔ ماقتبس ڈاکٹر شفیق الرحمن

"دلبر جہانی لے کر بولا۔ انگریز ہر وقت کرکٹ کرتے رہتے ہیں۔ محبت ہو جانے پر عاشق "بولڈ" ہو جاتا ہے۔ کوئی محبوب سے جھوٹ بولے تو کہا جاتا ہے کہ یہ کرکٹ نہیں ہے۔ شادی ہونے پر بیوی اسے "اسٹپ" کر دیتی ہے۔ ملازمت سے سبک دوش ہوتے وقت اطمینان کا اظہار کرتا ہے کہ شکر ہے "اتلگز" اچھی خاصی رہی لیکن یہ باتیں کبھی کبھی کھلیے جانے والے ٹپٹ میچوں کی ہیں۔"

غرض اس طرح ڈاکٹر شفیق الرحمن کے اکثر افسانوں میں کرکٹ کا ذکر کسی نہ کسی انداز سے ضرور ہوتا ہے۔ جوان کی کرکٹ سے بے پناہ دلچسپی کا باعث ہے۔ کمال کی بات تو یہ ہے کہ کرکٹ کے اس قدر ذکر کے باوجود قاری کبھی بور نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ افسانے میں اس کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس کا پہلا سبب آپ کا انداز بیان بے پناہ دلکش ہے ساتھ ہی آپ نے کبھی ایک بھی بات کو نہیں دہرا�ا ہے۔ ہر افسانے میں کرکٹ کا ذکر ایک نئے انداز سے کیا ہے اور موقع و محل کا خاص خیال رکھا ہے اور افسانے کے موضوع کے اعتبار سے کرکٹ کی مختلف کیفیات کو برتا ہے۔ جس سے یکسانیت کا احساس بالکل نہیں ہوتا ہے اور افسانہ زندگی سے قریب تر ہو کر قاری کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اسی انفرادیت نے ڈاکٹر شفیق الرحمن کو دوسرے افسانہ نگاروں سے منفرد بنادیا ہے۔ میرے خیال میں اردو ادب کے کسی بھی افسانہ نگار نے اپنے پسندیدہ کھیل کو اس طرح اپنے افسانوں کا موضوع نہیں بنایا ہے۔ جس طرح ڈاکٹر شفیق الرحمن نے کرکٹ کو موضوع بنایا کہ اردو ادب کو لازوال افسانے دیے ہیں جو اردو ادب کے سرمائے میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں اور ڈاکٹر شفیق الرحمن کو ایک الگ حیثیت کا حامل بنادیتے ہیں۔ جو ڈاکٹر

شفیق الرحمن کو ایک منفرد مقام اردو افسانے میں عطا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم ان کا مقابلہ رشید احمد صدیقی سے کر سکتے ہیں کہ ان کی تحریروں میں کسی نہ کسی بہانے علی گڑھ کا ذکر آبی جاتا ہے، جو ان کا محبوب ترین موضوع ہے باکل یہی کیفیت کرٹ کے معاملے میں ڈاکٹر شفیق الرحمن کی ہے۔



ڈاکٹر شفیق الرحمن کا

ادبی مقام

اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت بہت پرانی ہے۔ جب سے تخلیقی ادب لکھا جانا شروع ہوا ہے، اس وقت سے ہی مزاحیہ ادب کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتا ہے۔ اس کی ابتداء کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ انسانی زندگی میں خوشیاں بیس تو غم بھی بیس اور جب کسی شاعر یا ادیب نے اپنے تخلیقی فن پارے میں زندگی کی ترجیحی کی تو، جیاں غموم، دکھوں اور پیشانیوں کا ذکر کیا تو وہیں دوسری طرف وہ خوشیوں، مسرتوں کو نظر انداز نہیں کر سکا۔ اس لیے اردو ادب میں زبان و بیان کے ارتقا کے ساتھ ساتھ مزاحیہ ادب برابر ملتا ہے اور اس کی روایتوں سے اردو ادب مالا مال نظر آتا ہے۔ مثلاً غالب ہی کو لمحے۔ وہ ایک عظیم شاعر تھے لیکن ان کی زندہ دل شخصیت نے لوگوں کو منے بنانے کے بہت سے سامان فراہم کیے اور لوگ اپنا غم بھول کر ان کی باتوں سے لطف لیتے تھے۔ غالب کے خطوط نے بھی مزاحیہ ادب کا بڑا سرمایہ چھوڑا ہے چھوٹے چھوٹے

جملوں میں بڑی سے بڑی باتیں کہے گئے ہیں کہ لوگ آج تک سر دھنے رہتے ہیں اسی طرح پنڈت رتن ناٹھ سرشار نے اردو ادب کو "خوجی" کا لازوال کردار دیا۔ جو اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس کے بعد سجاد حسین، امتیاز علی تماج وغیرہ اردو ادب پر مزاح نگار کی حیثیت سے ابھرے اور " حاجی بغلول"، "چچا چھکن" جیسے لافانی کردار اردو ادب کو دیے۔ جنہیں اردو والے کبھی بھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ ٹھیک اسی طرح ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اردو ادب کو "شیطان" کا کردار عطا کیا جو اردو ادب پر چھاگیا۔ اس کردار کو سجائے اور سنوارنے میں ڈاکٹر شفیق الرحمن نے بہت محنت کی ہے۔ ویسے تو یہ خیوقی کردار ہے لیکن اس کردار میں ڈاکٹر صاحب کی اپنی شخصیت بھی جھلکتی ہے۔

جب ڈاکٹر شفیق الرحمن نے ادبی زندگی کا آغاز کیا تو یہ ترقی پسندی کا زمانہ تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے ہولناک اثرات ساری دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ ذاتی غموں اور دکھوں کے ساتھ ساتھ لوگ غم دوراں میں بھی بستلے تھے۔ جس کی وجہ سے پورے ماحول اور سماج پر قنوطیت کا اندر ہمراہ چھایا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا اور اردو ادب کے ابتدائی دور کا جب بغور مطالعہ کرتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ اردو ادب پر پہلے سے بھی زیادہ قنوطیت حاوی تھی۔ ایسے میں ہمارے ادیب، خاص طور پر وہ حضرات جو ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ سو شلزم اور کمیونزم سے متاثر ہوئے اور انہوں نے امید کی شمعیں روشن کیں اور قنوطیت کو خیر باد کرنے کی سعی کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کرنے نے مسائل

سامنے آئے۔ زندگی کو سچے اور حقیقی روپ میں دیکھنے کا موقع ملا۔ ایسی صورت میں جب ڈاکٹر شفیق الرحمن کے مزاحیہ افسانے منظرِ عام پر آئے تو انہوں نے قارئین کے ذہنوں کو سکون بخشنا۔ کیوں کہ انہوں نے زندگی کے حسین پہلوؤں کی ترجیحی اپنے افسانوں میں اور زندگی کے خوبصورت لمحات کو اپنے افسانوں میں سونے کی کوشش کی تھی کہ افسانہ زیادہ سے زیادہ دلکش ہو سکے۔ رومانس ان کے افسانوں کا پسندیدہ موضوع تھا، اس لیے وہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے پسندیدہ افسانہ نگار بن گئے۔ رومانس کے ساتھ مزاح کی آمیزش نے ان کے افسانوں کے حسن کو دو بالا کر دیا ہے۔ احمد جمال پاشا ان کی افسانہ نگاری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"شفیق الرحمن کے یہاں زندگی اپنی بھرپور توانائی کے ساتھ آتی ہے۔ ان کے یہاں فکرِ جہاں بھی ہے اور غمِ جہاں بھی۔ چھوٹے اور بڑے مسائل کی نشاندہی بھی ہے اور زندگی کی نامواریوں پر خوشناطنز بھی۔۔۔۔۔"

ڈاکٹر شفیق الرحمن کے خیال میں خوشی اور سرسرت کا سرچشمہ ہمارے اپنے اندر ہوتا ہے اور جب یہ بتا ہوا دھارا خشک ہو جاتا ہے تو زندگی سے دلبستگی کم ہو جاتی ہے۔ افسانہ "ندو جزر" سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"در اصل یہ دنیا نہ تو غم کہہ ہے اور نہ راحت کہہ۔ یہاں سنج بنتے

بیں اور نہ خوشیاں تقسیم ہوتی ہیں۔ نہ ہی یہ ایک عذاب ہے نہ دلکش سپنا۔ یہ تو ایک خلا ہے۔ ایک وسیع خلا۔ جس میں بذاتِ خود زندگی کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ یہاں ہمارا دل نور کا منج ہے۔ اس کی جلا سے ہماری روح روشن ہے۔ اس سے ہماری آنکھوں میں یہ تروتازگی اور ہونوں پر مسکراہٹ ہے۔ جب تک یہ شمع جلتی رہتی ہے۔^۱

اس طرح گھرے مسائل پر ڈاکٹر شفیق الرحمن نے قلم انھایا اور اپنی بلکلی پھلکی نثر سے زندگی میں ایک نئی روح پھونکی۔ صدمات سے سکڑے ہوئے اور فکروں اور پریشانیوں میں ڈوبے ہوئے انسانوں کے ہونوں کو مسکراہٹیں بکھیرنا ڈاکٹر شفیق الرحمن نے سکھایا اور انہوں نے نامید کے انہیں کو امید کی روشنی سے دور کرنے کی کوشش کی۔ بقولِ حجاب امتیاز علی:

شفیق الرحمن کی کہانیوں میں تکلف اور پیچیدگیاں مطلق نہیں ہوتیں۔ ان کے روانی اور تفریحی دونوں قسم کے افسانوں میں ایک بے سانگھلی اور روانی ہے۔ افسانہ واقعات سے زیادہ کرداروں کے طرزِ عمل سے نشوونما پاتا ہے۔ وہ کرداروں کے ذہنی تجزیے سے زیادہ سرودکار نہیں رکھتے۔ ان کے خارجی طرزِ عمل سے لطف و دلپسی پیدا کرتے ہوئے تیزی سے گزر جاتے ہیں۔ تمام افسانوں کا تعلق درمیانی طبقے کی زندگی سے ہے۔^۲

^۱ موجز ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ ص۔ 200۔ افسانہ۔ موجز

^۲ کریم ڈاکٹر شفیق الرحمن۔ دبپ۔ ص۔ 7۔

یہ امر انتہائی افسوس ناک ہے کہ ہمارے نقادوں نے ڈاکٹر شفیق الرحمن
 کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی اور نہ بھی ان کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش
 کی۔ ہر نقاد نے ان کی شگفتہ نثر اور لطیفوں کا ذکر کر کے بات کو ختم کر دیا لیکن
 اس شگفتہ نثر اور لطیفوں کے پس منظر کیا ہے۔ یہ جانتے کی انہوں نے ذرا بھی
 کوشش نہیں کی۔ آپ سوچتے ہوں گے اور یہ سوال یقیناً ایک قاری کی
 حیثیت سے کبھی نہ کبھی آپ کے دل و دماغ میں ابھرتا ہو گا کہ یہ بلکا پھلکا ادب
 کیا ایک عمودی نقطہ نگاہ سے لکھا گیا ہے یا صرف تفریج کا سامان فراہم کرتا ہے
 نہیں؟ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن کی نظر بہت گری ہے اور یہ
 حقیقت ہے کہ انہوں نے لطیفوں سے ضرور کام لیا ہے مگر ایس چنکیاں لی بیں
 اور بلکل پھلکی نہ میں بھی ایسے طنز کے تیر بر سائے بیں اور باتوں باتوں میں وہ
 بڑی بڑی باتیں کہے گئے بیں کہ ایک سنجیدہ فلسفی یا مفکر زندگی کی ان الجھنوں کو
 سلیمانی میں خاصہ وقت صرف کرنے کے باوجود اتنی آسانی سے آپ کو عیاں
 نہیں کر سکتا ہے۔ جتنا کہ ڈاکٹر شفیق الرحمن نے کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے
 کہ انہوں نے زندگی کو کس قدر سچائی اور سنجیدگی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا
 ہے اور جو نقاد یہ کہتے ہیں کہ وہ اعلیٰ طبقے کی زندگی کو روادوی سے پیش کر جاتے
 ہیں، وہ غلط ہے۔ بے معنی ہے۔ بے بنیاد ہے۔ یہ تو یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں
 ناامیدی کے اندر ہیروں سے نکال کر امید کی روشنی عطا کی ہے اور زندگی کے
 حسین خطوط کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن نے کبھی زندگی سے فرار کی راہ اختیار نہیں کی اور ان

کے نزدیک فرار ممکن بھی نہیں ہے۔ اگر غم ہمارا مددگار ثابت نہیں ہوتا ہے تو کیوں نہ ہم مسروں کو اپنائیں جو ہر حالت میں ہمارے لیے باعثِ رحمت ہیں۔ سی وجہ ہے کہ ڈاکٹر شفیق الرحمن کے افسانوں کے تمام کردار ایک عام انسان ہوتے ہیں۔ جن کی زندگیوں میں خوشیاں بھی ہیں تو غم بھی ہیں اور دونوں کا مقابلہ اپنی بساط کے مطابق کرتے ہیں اور جیسے کی جدوجہد کو برابر جاری رکھتے ہیں۔ سی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں زندگی کے گئے چنے مسائل نہیں ہیں۔ انہوں نے زندگی کو خانوں میں نہیں بنانا ہے۔ جو بھی موضوع یا مسائل ان کی توجہ کا مرکز بنتا۔ اسے افسانے میں ڈھال دیتے۔ اس لیے کائنات اور اس کی حقیقتیں ان کے افسانوں میں جا بجا بکھری ملتی ہیں اور زندگی کی تازگی اور شکستگی کا احساس ہوتا ہے اور زندگی کا ایک صحت مند نظریہ سامنے آتا ہے۔ اور ایک عام قاری کو بھی صحت مندانداز سے سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ اسی لیے اس کا بیرو بیرو دن کی جدائی میں کبھی مجنوں نہیں بنتا ہے وہ زندگی کی حقیقوں سے آنکھ ملانے کے بعد اپنی راہ الگ اختیار کر لیتا ہے۔ اسی لیے ان کے افسانے ہر خاص و عام پر ایک خاص اثر چھپوڑ جاتے ہیں بقول محمد شار الحمید

صاحب:

ڈاکٹر شفیق الرحمن کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ قاری کے ذہن پر شعوری طور پر اپنا اثر چھپوڑ جاتے ہیں۔ قاری ان کے پیغام کو شعوری طور پر نہیں سمجھ پاتا ہے لیکن لاشعوری انداز میں اس سے نہ صرف متاثر ہوتا ہے بلکہ اپنی زندگی کو بھی اس

نجع پر چلانے کی کوشش کرتا ہے۔ لہذا شفیق الرحمن کو
 محض لطیفہ گو یا تفریحی ادب کا علم بردار اور شوخ رنگوں کا
 خالق بھی نہ سمجھنا چاہیے۔ ان لطائف اور شوخ رنگوں کو منتہی
 مقصود نہ خیال کرنا چاہیے بلکہ قرین قیاس رائے یہ ہے کہ
 شفیق الرحمن اس تفریحی ادب، شوخ رنگوں اور لطائف سے
 زندگی کی بے رونقی کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ زندگی کی بے رنگ
 تصویر میں رنگینی پیدا کرنے کے خواباں میں ماکہ وہ آسان اور
 دلپس پ بن جائے، گویا وہ ایک مستقل نظریہ حیات کے حامل
 ہیں۔ جس کی تشریف وہ اپنی مزاح خیر بلکلی پھلکی نثر میں کر رہے
 ہیں۔

ڈاکٹر شفیق الرحمن نے اپنے ان خیالات کو فلسفیانہ انداز سے، مشکل الفاظ
 میں اگر پیش کیا ہوتا تو ان کا یہ پیغام ہرگز مقبول نہ ہوتا اور نہ ہی ہر خاص و
 عام تک پہنچ سکت ا تھا۔ وہ محدود ہو کر رہ جاتا اور اپنا اثر بھی کھو دیتا۔ یہی ڈاکٹر
 شفیق الرحمن کی سب سے بڑی دین ہے کہ انہوں نے عام فہم جذبات اور
 خیالات کو مفکرانہ انداز میں نہ بیان کر کے ایک کام انجام دیا ہے۔ اس لیے
 انہوں نے مزاح کا سہارا لیا۔ لطیفیے سنائے، پیر و دیاں لکھیں لیکن اپنی بات، اپنا
 مقصد، اپنا پیغام ہر ایک تک پہنچا دیا۔ اور آج ڈاکٹر شفیق الرحمن کا شمار اردو کے
 صفحہ اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے اسلوب اور طرز نگارش

کے اعتبار سے ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی روایت خود الگ قائم کی ہے وہ اپنے طرز تحریر کی کھنک کے باعث اردو ادب کے واحد ایسے افسانہ نگار ہیں جن کا کسی سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بقولِ احمد پاشا:

”شفیق الرحمن اردو طنز و مزاح میں خالص ظرافت کے امام ہیں۔ کرنیں، لہریں، پچھتاوے۔ مدد جزر شگونے، حماقتیں، مزید حماقتیں وغیرہ ان کے رومانی اور مزاحیہ معنا میں و افسانوں کے مجموعہ ہیں۔“^۱

وقار عظیم فرماتے ہیں:

”شفیق الرحمن نے اپنے افسانوں کے لیے ایک نئی فضنا بنائی ہے اور اس نئی فضنا میں ہمیں جا بجا شفیق کی رنگیں اور شوخی جھلکتی دکھانی دیتی ہے۔ رومانس کی اس بلکلی پھلکلی دنیا کی بھی بھلا سکیں گے اور نہ اس کے افسانوں کو۔“^۲

ڈاکٹر محمد عسکری صاحب نے ڈاکٹر شفیق الرحمن کے افسانوں پر اظہار خیال ان الفاظ میں کیا ہے جو بہت اہم اور معنی خریز ہے:

”سارے نئے ادب میں بس لے دے کے ایک شفیق الرحمن صاحب ہیں۔ جنہوں نے تفریحی ادب کی طرف توجہ کی ہے۔ یہ

^۱ اردو ادب میں طنز و مزاح آزادی کے بعد۔ احمد جمال پاشا ص 46

^۲ آج کل دلی اردو نمبرا

^۳ نیا افسانہ۔ وقار عظیم ص 191

ٹنگنگی۔ یہ لا ابالی پن۔ یہ مچلتی ہوئی جگہ گاہت بس ان کا حصہ ہے۔ ”

کرشن چندر نے اپنے مخصوص انداز سے ڈاکٹر شفیق الرحمن کے اسلوب اور افسانوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس میں زندگی مختلف رنگوں میں بکھری نظر آتی ہیں۔ فرماتے ہیں:

شفیق الرحمن کے افسانے پڑھ کر شوخ رنگوں کی یاد تازہ
ہو جاتی ہے۔ سرخ اسرخ نارنجی، یاقوتی زعفرانی..... ۔۔۔۔۔

الغرض ڈاکٹر شفیق الرحمن ترقی پسند تحریک کے زمانے سے لے کر آج تک برابر لکھ رہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ خدا انھیں اور لمبی زندگی عطا کرے تاکہ وہ اردو ادب کے سرمائے کو اور مالا مال کر سکیں۔ ڈاکٹر شفیق الرحمن کا شمار ان افسانہ نگاروں میں بھی ہوتا ہے جو ساری زندگی ادب سے جڑے رہے ہیں۔ آپ کا قلم ابھی بھی تھکا نہیں ہے اور مسلسل لکھ رہے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی نئی تحریریں ہم تک ہندوستان میں آسانی سے نہیں سچنچ پار جی ہیں آپ نے شروع سے اپنا ایک معیار رکھا اور آج تک اس پر قائم ہیں۔ اسی وجہ سے میں انھیں اردو کا خوش قسمت ترین ادیب مانتی ہوں کہ کوئی بھی نقاد ان پر انگلی نہیں انہا سکا۔ کیوں کہ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا بست سوچ سمجھ کر، غور و فکر کے بعد لکھا۔ انہوں نے جو ادنی سرمایہ خواہ افسانوں کی صورت میں ہو یا

مزید حاقدیتیں ڈاکٹر شفیق ارجمند کوہیج

مزید حقیقیں۔ ذاکر شفیق ارجمند کو رجع

انشائی یا پیروڈیاں سب جی قابل تعریف ہیں اور اردو ادب کے سرمائے میں
گراں قدر اضافہ کرتی ہیں اور ڈاکٹر شفیق الرحمن کا شمار اردو کے صفوں کے
افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔





ڈاکٹر رحیماتہ پیدرویں